قلبِ قرآن

سُورۂ یٰسٓ

کی مختصر تشریح

از

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مُرتّبہ

پروفیسر خلیل الرحمٰن

لیفٹیننٹ کرنل (ر) عاشق حسین

مکتبہ خُدّام القُرآن لاہور

36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون : 3-35869501

maktaba@tanzeem.org

مؤسس انجمن خدام القرآن جناب ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کی اپنی دلی خواہش اور جدوجہد کے تقاضوں کے عین مطابق' مرحوم کے تمام قانونی وارثین ہر مسلمان کو ڈاکٹر صاحبؒ کی طبع شدہ تصنیفات/ تالیفات' آڈیوز' ویڈیوز کو طبع/ تیار کر کے شائع کرنے کی کھلی اجازت دیتے ہیں (چاہے قیمتاً ہو یا مفت تقسیم) اور اس کے لیے کسی پیشگی اجازت کی ضرورت نہیں۔ ہمارا کسی قسم کی رائلٹی یا ''محفوظ حقوق'' کا تقاضا بھی نہ ہے اور نہ ہوگا' البتہ تیار کردہ مواد (آڈیوز یا ویڈیوز) اور کتب کے چند نسخے ہمارے ریکارڈ کے لیے بھیج دیے جائیں تو ممنون ہوں گے۔ تاہم ان میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی ناپسندیدہ کوشش مثلاً تبدیلی الفاظ' غلط اقتباس' سیاق وسباق سے الگ کر کے جملے کا حوالہ یا اس کا ایسا استعمال جس سے ڈاکٹر صاحب مرحوم اور ہمارے موقف کی صحیح ترجمانی نہ ہو اور جس سے ہماری عزت وشہرت پر حرف آئے' تو ہم اس شخص کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا مکمل حق محفوظ رکھتے ہیں۔

نام کتاب ——— قلبِ قرآن: سُورۂ یٰسٓ

طبع اوّل (مئی 2017ء) ——— 3300

ناشر ——— ناظم نشرواشاعت' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ——— 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

فون: 35869501-3

مطبع ——— مکتبہ جدید پریس لاہور

قیمت ——— 130 روپے

ISBN: 978 - 969 - 606 - 049 - 9

email:publications@tanzeem.org
website:www.tanzeem.org

فہرست

- تمہیدی کلمات 5
- رکوع ۱ ——— (آیات ۱ تا ۱۲) ——— 12

حروفِ مقطعات کے بارے میں چند حقائق
حضور ﷺ کا اصل معجزہ: قرآن حکیم
.....دیں ہمہ اوست
اللہ تعالیٰ کا قانون ہدایت وضلالت
ذکر کا جامع مفہوم

- رکوع ۲ ——— (آیات ۱۳ تا ۳۲) ——— 62

بستی والوں کی عبرت آموز مثال
''بلاغِ مبین'' کے حقیقی تقاضے
رسول مغلوب نہیں ہوتے!

- رکوع ۳ ——— (آیات ۳۳ تا ۵۰) ——— 84

سورۂ یٰسٓ کا قلب
آیت: ذریعۂ تذکیر
ربوبیتِ الٰہی کے آثار ومظاہر
آیاتِ آفاقیہ

- رکوع ۴ ——— (آیات ۵۱ تا ۶۷) ——— 117

نفخۂ صور اور اس کے مرحلے
اہلِ جنت کے مشاغل
مجرموں اور نیکوکاروں میں تفریق
تنبیہاتِ الٰہیہ سے ڈرنے اور سبق حاصل کرنے کی ضرورت

- رکوع ۵ ——— (آیات ۶۸ تا ۸۳) ——— 136

حیاتِ انسانی کی ایک اہم حقیقت
قرآن کا مقصدِ نزول
توحید، تذکیر اور تشکر
انسان کی تخلیق: دعوتِ فکر

عرضِ مُرتّب

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی علمی میراث کا غالب اور اہم ترین حصہ سورۃ الفاتحہ سے لے کر سورۃ الناس تک ان تفصیلی دروسِ قرآن پر مشتمل ہے جن کا سلسلہ ان کی زندگی میں مختلف فورمز پر لگ بھگ نصف صدی تک جاری رہا۔ ''بیان القرآن'' کے عنوان سے ماہ رمضان المبارک کے دوران ان کے شہرۂ آفاق ''دورۂ ترجمہ قرآن'' کو بھی اسی سلسلے کی ایک خصوصی کڑی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان دروس کی ریکارڈنگ سے آج بھی دنیا بھر میں بلا مبالغہ لاکھوں افراد مستفیض ہو رہے ہیں' اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی مقبولیت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ جدید دور کی سائنسی ترقی نے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے میدان میں جو انقلاب برپا کیا ہے اس کی وجہ سے اب تعلیم و تعلّم کے انداز و اطوار بدلتے جا رہے ہیں' بلکہ اب تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ شعبہ بہت جلد قلم و قرطاس کے ''تکلفات'' سے بھی آزاد ہو جائے گا۔ بہرحال اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اس تمام تر ترقی و تجدّد کے باوجود جہاں تک ''کتاب'' کی اہمیت اور افادیت کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ برقرار ہے اور مستقبل میں بھی برقرار رہے گی۔ چنانچہ مذکورہ دروس کی آڈیو ویڈیو ریکارڈنگ اعلیٰ معیار کی جدید ترین ورائٹی میں اگرچہ دنیا کے طول و عرض میں ہر وقت' ہر جگہ دستیاب ہے' لیکن اس کے باوجود ہم سمجھتے ہیں کہ ان ملفوظاتِ گراں مایہ کو پردۂ تقریر سے احاطۂ تحریر میں منتقل کر کے کتابی شکل میں شائع کرنا اشد ضروری ہے۔

یہ کتاب دراصل اسی سوچ کو روبہ عمل لانے کی کوشش کا نقطہ آغاز ہے۔ اس مبارک مہم کے آغاز کا سہرا پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب کے سر ہے' جنہوں نے کمال محنت' شوق اور احتیاط سے سورۂ یٰسٓ کے دروس کی ویڈیو ریکارڈنگ کے الفاظ و کلمات کو تحریر و کتابت کا جامہ پہنایا۔ ان کی اس تحریر کو مزید ایڈیٹنگ اور بعض ضروری تبدیلیوں کے بعد اب نذرِ قارئین کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ پروفیسر صاحب کی محنت کو شرفِ قبولیت عطا فرماتے ہوئے اس کتاب کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ اللہ کرے کہ یہ تالیف مذکورہ دروس پر مشتمل پورے علمی خزانے کو مطبوعہ شکل میں منظرِ عام پر لانے کے ہمارے خواب کو حقیقت میں بدلنے کے منصوبے کا پیش خیمہ ثابت ہو اور اس کے بعد باقی سورتوں کے دروس کو بھی یکے بعد دیگرے زیورِ طباعت سے آراستہ کرنے کے اسباب پیدا ہوتے چلے جائیں۔ آمین!

لیفٹیننٹ کرنل (ر) عاشق حسین

۱۲ شعبان المعظم ۱۴۳۸ھ

سُورۂ یٰسٓ

تمہیدی کلمات

سورۂ یٰسٓ کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ((یٰسٓ قَلْبُ الْقُرْآنِ)) ''سورۂ یٰسٓ قرآن کا دل ہے''۔ اس حدیث کو امام احمدؒ امام ابوداؤدؒ امام نسائیؒ امام ابنِ ماجہ اور امام طبرانی رحمہم اللہ نے حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے۔ ایک دوسری روایت میں اس سورت کے بارے میں حضور ﷺ کا یہ حکم ملتا ہے: ((اِقْرَءُوْا سُوْرَةَ یٰسٓ عَلٰی مَوْتَاکُمْ)) ''اپنے مرنے والوں پر سورۂ یٰسٓ پڑھا کرو''۔ اس روایت کے راوی بھی حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ ہی ہیں اور اسے بھی امام احمدؒ ابوداؤد اور ابن ماجہ نے نقل فرمایا ہے۔

جہاں تک اس دوسری حدیث کا تعلق ہے اس پر تو آج بھی ہمارے ہاں عمل ہو رہا ہے۔ یعنی اگر موقع میسر آ جائے تو اکثر و بیشتر لوگ اپنے عزیزوں کی کیفیتِ نزع کے وقت سورۂ یٰسٓ کی تلاوت کا اہتمام کرتے ہیں۔ لیکن موجودہ دور میں بدقسمتی سے ہمارے معاشرے کی جو صورت حال ہے اس کی وجہ سے یہ عمل بھی محض ایک رسم بن کر رہ گیا ہے۔ حضور ﷺ کے فرمان کی تعمیل کے حوالے سے یقیناً یہ عمل حصولِ برکت کا ذریعہ بھی ہوگا' باعثِ ثواب بھی ہوگا اور اس کے کچھ نہ کچھ مثبت اثرات بھی ضرور مرتب ہوتے ہوں گے' لیکن اس ضمن میں اصل صورتِ حال یہ ہے کہ سننے والے کو کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا سن رہا ہے۔ (اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰہُ!)

دراصل حضور ﷺ کے مذکورہ فرمان کا تعلق اس سورۂ مبارکہ کے مضامین سے ہے۔ اگرچہ نزع کے وقت عام طور پر انسان کے باقی حواس تو معطل ہو جاتے ہیں' لیکن اس کے فہم و ادراک کی صلاحیت کسی نہ کسی درجے میں آخری وقت تک باقی رہتی ہے۔ چنانچہ اس وقت متعلقہ شخص کو سورۂ یٰسٓ سنانے کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا سے روانہ ہوتے ہوئے اگر اس سورت کے مضامین کا مفہوم اس کے شعور میں داخل ہو جائے تو توقع کی جا سکتی ہے کہ اس سے

اس کا سویا ہوا ایمان جاگ اٹھے گا اور اس کی وجہ سے اس کی اگلی منازل میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔ بہرحال آج قرآن مجید کے ساتھ ہمارے تعلق کی جو عمومی صورت حال ہے اس کے پیش نظر علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں ہمارے مذکورہ معمول کا ذکر طنزیہ انداز میں کیا ہے:۔

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست کہ از یٰسینِ او آساں بمیری

''اے مسلمان! اس (قرآن مجید) کی آیات کے ساتھ آج تمہارا اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں رہا ہے کہ تم اس کی سورۂ یٰسٓ کے ذریعے آسانی سے مرنا چاہتے ہو۔''

ظاہر ہے جو کتاب انسان کو زندگی گزارنے کے قواعد وضوابط سکھانے کے لیے نازل ہوئی تھی، اگر اس کے ماننے والوں کے ہاں اس کا مصرف صرف یہی رہ جائے کہ وہ اس کے وسیلے سے آسان موت مرنے کے متمنی ہوں تو یہ طنز اپنی جگہ درست ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس عمل کو ترک کر دیا جائے، جبکہ ہمارے پاس اس کی تلقین وتاکید پر مبنی نبی اکرم ﷺ کی مستند حدیث بھی موجود ہے۔

یٰسٓ: قرآن کا دل

جہاں تک مذکورہ بالا پہلی روایت کا تعلق ہے جس میں اس سورۂ مبارکہ کو قرآن حکیم کا دل قرار دیا گیا ہے، اس کی توضیح وتوجیہہ مختلف لوگوں نے مختلف انداز میں کی ہے، لیکن ذاتی طور پر میرا دل ان میں سے کسی بھی رائے یا توجیہہ پر مطمئن نہیں ہوا۔ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کرنے سے قبل یہاں پر میں یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ حضور ﷺ کی احادیث پر علمی وتحقیقی انداز میں غور وخوض کرنے اور آپؐ کے احکامات وفرمودات کی عقلی توجیہات تلاش کرنے کی اہمیت وافادیت اپنی جگہ، لیکن اس ضمن میں بنیادی طور پر ہمیں یہ بات ہر حال میں پیش نظر رکھنی چاہیے کہ حضور ﷺ کے ہر فرمان کو محبت وعقیدت سے قبول کرنا اور آپؐ کے ہر حکم پر بلا چون وچرا سرِ تسلیم خم کر دینا ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ آپؐ کے فرمان کی کوئی توجیہہ ہماری سمجھ میں آ جائے تو فَبِهَا —— نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ —— لیکن اگر کسی وقت آپ ﷺ کا کوئی فرمان منطقی اعتبار سے ہمیں سمجھ نہ بھی آئے تو بھی یقین رکھنا چاہیے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے تو ایسا ہی ہوگا اور اس میں ضرور کوئی حکمت ہوگی۔

اب جہاں تک حضور ﷺ کے مذکورہ فرمان کی توجیہہ کا تعلق ہے اس کا ایک پہلو تو میری

سمجھ میں یہ آتا ہے کہ اس سورت کا اسلوب اور انداز بہت خاص ہے۔ اس اسلوب کے اعتبار سے میری نظر میں اس سورت کی قریبی مشابہت و مناسبت اکیسویں پارے کی سورۃ السجدہ کے ساتھ ہے (حضور ﷺ جمعہ کے دن فجر کی پہلی رکعت میں عموماً سورۃ السجدہ کی تلاوت فرمایا کرتے تھے)۔ ان دونوں سورتوں کی دو خصوصیات بہت نمایاں ہیں —— ایک تو یہ کہ دین کی بنیادی تعلیمات یعنی ایمانیاتِ ثلاثہ (توحید' معاد اور رسالت) کا ذکر ان دونوں سورتوں میں بہت جامعیت کے ساتھ آیا ہے۔ اور دوسرے ان سورتوں کے مضامین باہم اس قدر مربوط ہیں کہ ان میں سے کسی ایک مضمون کو علیحدہ کرنا تقریباً محال ہے —— بہرحال سورۂ یٰسٓ کا اسلوب اور انداز ایک دھڑکتے ہوئے دل کی مانند ہے۔ یعنی اس سورت کو پڑھنے یا سننے سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے صوتی آہنگ اور rythm کی انسانی دل کی دھڑکن کے ساتھ ایک خاص مشابہت اور مناسبت ہے۔ (ہوسکتا ہے کہ فی الواقع بھی ایسا ہی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضور ﷺ کے مذکورہ فرمان کی وجہ سے یہ احساس میرے تحت الشعور میں جاگزیں ہو چکا ہو اور اس وجہ سے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہو)۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ اپنے مخصوص اسلوب کے باعث یہ سورت انسانی اعصاب اور احساسات کے اندر حرکت پیدا کرنے اور سوئے ہوئے ایمانی جذبات کو جگانے کے حوالے سے خصوصی تاثیر رکھتی ہے۔ میرے خیال میں اس حقیقت کا ادراک ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو اس سورت کی تلاوت کو اپنا معمول بنائے اور اس کے معانی و مفہوم کو اپنے دل میں جذب کرنے کی کوشش کرے۔ گویا جو کردار ہمارا دل ہمارے مادی وجود کی زندگی کو قائم و دائم رکھنے کے لیے ادا کرتا ہے' عین وہی کردار ہمارے جذباتِ ایمانی کا اضمحلال دور کرنے اور ان جذبات میں تازہ حرکت و حرارت پیدا کرنے کے حوالے سے یہ سورت ادا کرتی ہے۔ میرے خیال میں اسی وجہ سے حضور ﷺ نے یہ تلقین فرمائی ہے کہ یہ سورت فوت ہونے والے شخص کو سنائی جائے' تاکہ اس کی تاثیر سے مرنے والے کے جذباتِ ایمانی میں ایک تازہ حرارت پیدا ہو جائے اور اس طرح شاید اگلی منازل کے کٹھن مراحل اُس کے لیے آسان ہو جائیں۔ (واللہ اعلم بالصواب!)

نظمِ قرآن اور قرآنِ مجید کی ترکیب و تقسیم

حضور ﷺ کے مذکورہ فرمان کی دوسری توجیہہ جو میری سمجھ میں آتی ہے اس کا تعلق

سورتوں کے نظم سے ہے۔ چنانچہ اسے سمجھنے کے لیے سورتوں کے نظم کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو یہ نکتہ مدنظر رہنا چاہیے کہ قرآن مجید کی ۱۱۴ سورتوں کی جو ترتیب مصحف کے اندر ہے لوحِ محفوظ میں بھی ان کی بالکل یہی ترتیب ہے۔ اس ترتیب میں کیا کیا حکمتیں پوشیدہ ہیں یہ تو اللہ ہی جانتا ہے' البتہ غور و فکر کے ذریعے انسانی سطح پر بھی اس بارے میں کسی نہ کسی حد تک آگاہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ مولانا حمید الدین فراہیؒ نے سورتوں کے نظم اور ترتیب کے بارے میں فکر و تدبر اور غور و خوض کے نتیجے میں بہت سی مفید معلومات اخذ کی ہیں۔ مولانا صاحب کی اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی ۱۱۴ سورتیں بنیادی طور پر سات گروپس میں منقسم ہیں۔ ان میں سے ہر گروپ کا آغاز ایک یا ایک سے زائد مکّی سورتوں اور اختتام ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتوں پر ہوتا ہے۔ اس طرح ان میں سے ہر گروپ کو ''مکّی مدنی سورتوں کا گروپ'' کہا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ ان سورتوں کے ان گروپس یا اس تقسیم کا قرآن مجید کی سات منازل یا سات احزاب کی تقسیم سے کوئی تعلق نہیں۔ سات منزلوں کی تقسیم میں مکی مدنی سورتوں کے ربط کو پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ یہ تقسیم حضور ﷺ اور صحابہؓ کے دور میں موجود تھی۔ یہ سات منازل دراصل ہفتے کے سات دنوں کی مناسبت سے مقرر کی گئی ہیں' تاکہ اگر کوئی شخص ایک ہفتے میں پورے قرآن مجید کی تلاوت مکمل کرنا چاہے تو وہ روزانہ ایک منزل پڑھ لیا کرے (روایات سے پتا چلتا ہے کہ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسی معمول کو اپنائے ہوئے تھے)۔ یہ سات منازل آپس میں ''بالکل'' برابر یا مساوی تو نہیں' البتہ ''تقریباً'' مساوی ہیں۔ دراصل انہیں برابر کرنے کے لیے سورتوں کو منقطع نہیں کیا گیا' جیسا کہ پاروں کی تقسیم میں کیا گیا ہے (پاروں کی تقسیم حضور ﷺ کے زمانے میں موجود نہیں تھی' یہ بعد کے کسی دور میں کی گئی ہے)۔ سات منازل یا سات احزاب کی اس تقسیم میں بھی سورتوں کی تعداد کے حوالے سے ایک خاص تناسب اور حسن کار فرما نظر آتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الفاتحہ کو اگر قرآن مجید کے مقدمہ یا دیباچہ کی حیثیت سے اس تقسیم سے الگ رکھیں تو ہر حزب یا منزل میں سورتوں کی تعداد اس طرح ہے:

پہلے حزب میں ۳ سورتیں —— (سورۃ البقرۃ تا سورۃ النساء)

دوسرے حزب میں ۵ سورتیں —— (سورۃ المائدۃ تا سورۃ التوبہ)

تیسرے حزب میں ۷ سورتیں —— (سورۂ یونس تا سورۃ النحل)
چوتھے حزب میں ۹ سورتیں —— (سورۃ بنی اسرائیل تا سورۃ الفرقان)
پانچویں حزب میں ۱۱ سورتیں —— (سورۃ الشعراء تا سورۂ یٰسٓ)
چھٹے حزب میں ۱۳ سورتیں —— (سورۃ الصافات تا سورۃ الحجرات)

اور ساتویں حزب میں ۶۵ سورتیں۔ ۱۳ اور ۶۵ کے اعداد کے مابین نسبت واضح ہے۔ یعنی ۶۵ کا عدد ۱۳ کا حاصل ضرب ہے۔ ان میں سے ساتواں حزب ''حزبِ مفصّل'' کہلاتا ہے۔ یہ حزب سورۂ قٓ سے شروع ہو کر سورۃ الناس پر ختم ہوتا ہے۔

جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر کیا گیا ہے' سات احزاب یا منازل مقدار یا طوالت کے اعتبار سے تقریباً مساوی ہیں' لیکن مکی مدنی سورتوں کے سات گروپس آپس میں مساوی نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض گروپس بہت چھوٹے' جبکہ بعض بہت بڑے ہیں۔ مثلاً:

پہلے گروپ میں سورۃ الفاتحہ مکی ہے اور سورۃ البقرۃ' سورۂ آل عمران' سورۃ النساء' سورۃ المائدۃ مدنیات ہیں۔ یہ ایک طویل گروپ ہے جو تقریباً سوا چھ پاروں پر مشتمل ہے۔

دوسرے گروپ میں دو مکی سورتیں' یعنی سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف اور دو مدنیات' یعنی سورۃ الانفال اور سورۃ التوبہ ہیں۔

تیسرے گروپ کا آغاز سورۂ یونس سے ہوتا ہے۔ اتفاقاً سورۂ یونس سے تیسرا حزب بھی شروع ہوتا ہے۔ اس گروپ میں سورۂ یونس تا سورۃ المؤمنون ۱۴ مکی سورتیں اور ایک مدنی سورت (سورۃ النّور) شامل ہے۔

چوتھے گروپ میں سورۃ الفرقان تا سورۃ السجدۃ ۸ مکی سورتیں ہیں اور ان کے آخر میں سورۃ الاحزاب مدنی سورۃ ہے۔

پانچویں گروپ میں سورۂ سبا تا سورۃ الاحقاف ۱۳ مکی سورتیں (انہی مکیات میں تیسری سورۃ سورۂ یٰسٓ ہے) اور سورۂ محمد (ﷺ)' سورۃ الفتح اور سورۃ الحجرات ۳ مدنی سورتیں ہیں۔

چھٹے گروپ میں ۷ مکیات (سورۂ قٓ تا سورۃ الواقعہ) اور ۱۰ مدنیات (سورۃ الحدید تا سورۃ التحریم) ہیں۔

ساتویں گروپ میں سورۃ الملک سے سورۃ الاخلاص تک تمام مکی سورتیں ہیں۔ (ان میں

سے بعض سورتوں کو بعض مفسّرین مدنی بھی قرار دیتے ہیں)اور صرف آخری دو سورتیں (معوذتین) مدنی ہیں۔اس طرح اس گروپ میں ۴۶ مکی اور صرف دو مدنی سورتیں ہیں۔

اس تجزیے کے نتیجے میں یہ نقشہ بھی سامنے آتا ہے کہ پہلے گروپ میں صرف ایک مکی سورت (سورۃ الفاتحہ) ہے اور آخری گروپ میں صرف دو مدنی سورتیں (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلا گروپ بنیادی طور پر مدنی سورتوں کا مجموعہ ہے اور آخری گروپ مکی سورتوں کا۔جبکہ درمیانی پانچ گروپس میں سے ہر گروپ مکی سورتوں کا مجموعہ بھی ہے اور مدنی سورتوں کا مجموعہ بھی۔اس طرح سے گویا قرآن مجید میں چھ بڑے بڑے مجموعے مکی سورتوں کے ہیں اور چھ ہی مجموعے مدنی سورتوں کے۔

سورۂ یٰسٓ چونکہ مکی سورت ہے اس لیے زیرِنظر موضوع کو بہتر انداز میں سمجھنے کے لیے مکی سورتوں کے مضامین کا عمومی خاکہ بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے۔مکی سورتوں میں بنیادی ایمانی مباحث مثلاً توحید، رسالت اور آخرت کے مضامین پورے شد و مد اور دلائل و براہین کے ساتھ ایک مستقل مضمون کے طور پر بیان ہوئے ہیں۔ بلکہ طویل مکی سورتوں میں تو کوئی ایک سورت بھی ایسی نہیں ہے جس میں یہ تینوں مضامین زیرِبحث نہ آئے ہوں۔اس کے علاوہ بنیادی انسانی اخلاقیات مکی سورتوں کا چوتھا مستقل اور مشترک مضمون ہے۔یعنی ان سورتوں میں سچ بولنے، یتیموں کی سرپرستی کرنے، فقراء و مساکین کو کھانا کھلانے، وعدہ پورا کرنے جیسی ان اخلاقی اقدار پر بہت تکرار کے ساتھ زور دیا گیا ہے جو آفاقی طور پر مُسلّم ہیں۔مکّی سورتوں کے بعض مجموعوں میں ان میں سے بعض مضامین خصوصی طور پر زیادہ تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔مثلاً مکیات کے پہلے دو بڑے مجموعوں (ان میں پہلا مجموعہ سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف، جبکہ دوسرا مجموعہ سورۂ یونس تا سورۃ المؤمنون ۱۴ سورتوں پر مشتمل ہے) میں نبوت و رسالت کا مضمون بہت تکرار اور شد و مد کے ساتھ آیا ہے۔یعنی ان سورتوں میں انبیاء و رسل علیہم السلام کے حالات و واقعات اور ان کا انکار کرنے والی اقوام کی تباہی کا ذکر زیادہ نمایاں انداز میں آیا ہے۔اس کے بعد دوسرے دو مجموعوں (ان میں پہلا مجموعہ سورۃ الفرقان تا سورۃ السجدہ آٹھ سورتوں اور دوسرا سورۂ سبا تا سورۃ الاحقاف ۱۳ سورتوں پر مشتمل ہے) کی سورتوں میں زیادہ زور توحید پر ہے۔جبکہ آخری دو مجموعوں کے گروپ (سورۂ قٓ تا سورۃ الواقعہ سات سورتوں اور سورۃ

الملک تا سورۃ الاخلاص ۴۶ سورتوں) میں انذارِ آخرت اور جنت و دوزخ کا ذکر بہت کثرت سے آیا ہے۔ مکی سورتوں کے مضامین سے متعلق یہ نکتہ بھی مدنظر رہنا چاہیے کہ ان سورتوں میں شریعت کے احکام یعنی حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تفاصیل نہیں ملتیں۔

نظمِ قرآن کے اعتبار سے سورۂ یٰسٓ کا مقام

سورتوں کے نظم سے متعلق مذکورہ نکات اور مکی سورتوں کے مضامین کی اس ترتیب و تخصیص کو ذہن میں رکھتے ہوئے آیئے اب ہم قرآن مجید کے اندر سورۂ یٰسٓ کی مرکزی حیثیت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس ضمن میں سب سے پہلا نکتہ یہ سمجھ لیجیے کہ قرآن مجید کا مرکزی اور بنیادی مضمون توحید ہے جو دین کی اصل جڑ ہے۔ رسالت بھی توحید (اللہ تعالیٰ کی صفت ہدایت) ہی کا مظہر ہے اور آخرت بھی توحید ہی کی شرح ہے (آخرت میں اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کا خصوصی ظہور ہوگا)۔ چنانچہ قرآن مجید کا یہ مرکزی مضمون یعنی توحید مکی سورتوں کا بھی مرکزی اور بنیادی مضمون ہے۔ اس طرح مکی سورتیں گویا قرآن مجید کے قلب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور غالباً اسی نسبت سے مکی سورتوں کے دوسرے دو مجموعوں کا گروپ (اس گروپ کی سورتوں میں زیادہ زور توحید پر ہے) مذکورہ چھ مجموعوں کے عین درمیان میں واقع نظر آتا ہے۔ یعنی مصحف کے آغاز میں نبوت و رسالت کے مضمون پر مبنی سورتوں کے دو مجموعے ہیں' جبکہ اختتام پر انذارِ آخرت کے مضمون کی حامل سورتوں کے دو مجموعے ہیں اور درمیان میں اکیس مکی سورتوں پر مشتمل (سورۃ الفرقان تا سورۃ السجدہ آٹھ سورتوں پر مشتمل پہلا مجموعہ اور سورۂ سبا تا سورۃ الاحقاف ۱۳ سورتوں پر مشتمل دوسرا مجموعہ) وہ دو مجموعے ہیں جن میں توحید کا مضمون خصوصی شان کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ پھر ان دو مجموعوں کی ۲۱ سورتوں کی ترتیب کو دیکھیں تو سورۂ یٰسٓ ان سورتوں کے عین وسط میں ایک نگینے کی طرح جڑی نظر آتی ہے۔ یعنی سورۃ الفرقان تا سورۂ فاطر دس سورتیں ایک طرف اور سورۃ الصافات تا سورۃ الاحقاف دس سورتیں دوسری طرف اور قلب یعنی عین درمیان میں سورۂ یٰسٓ۔

پھر اس ضمن میں یہ نکتہ بھی لائق توجہ ہے کہ مذکورہ اکیس سورتوں کے گروپ میں سے بیس سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں (توحید کے مرکزی مضمون کی حامل سورتوں کے پانچ جوڑے سورۂ یٰسٓ سے پہلے اور اس مضمون کی حامل سورتوں کے پانچ جوڑے اس کے بعد) جبکہ سورۂ

یٰسٓ منفرد ہے۔اس کا کوئی جوڑ انہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے انسانی جسم میں بہت سے اعضاء جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ مثلاً ہاتھ' پاؤں' آنکھیں' کان' پھیپھڑے' گردے وغیرہ دو دو ہیں' لیکن دل ایک ہے' اس کی کوئی مثل انسانی وجود میں موجود نہیں۔ الختصر یہ کہ قرآن مجید کا مرکزی مضمون توحید ہے اور قرآن مجید کی وہ سورتیں جن میں توحید کا مضمون خصوصی شان سے بیان ہوا ہے قرآن مجید کے وسط میں واقع ہیں۔ جبکہ ان سورتوں کے عین وسط میں منفرد حیثیت سے سورۂ یٰسٓ کو رکھا گیا ہے۔ گویا اپنے مضمون کے اعتبار سے بھی اور مصحف میں سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے بھی سورۂ یٰسٓ کو قرآن مجید کے قلب کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ حضور ﷺ کے فرمان ((یٰسٓ قَلْبُ الْقُرْآنِ)) کی وہ دوسری توجیہہ ہے جو کسی درجے میں میری سمجھ میں آئی ہے۔ واللہ اعلم!

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رکوع ۱

يٰسٓ ﴿۱﴾ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳﴾ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴﴾
تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۵﴾ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۶﴾ لَقَدْ
حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۷﴾ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا
فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ﴿۸﴾ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ
خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۹﴾ وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ
لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰﴾ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ
بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۱﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا
قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۲﴾

آیت ۱ ﴿يٰسٓ ①﴾ ''یٰسٓ!''

اس سورۂ مبارکہ کی یہ پہلی آیت دو حروفِ مقطعات (ی اور س) پر مشتمل ہے۔ ایسے حروف کو ''مقطعات'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ انہیں جوڑ کر نہیں پڑھا جا سکتا۔ ہر حرف کو

علیحدہ علیحدہ پڑھنا ضروری ہے۔ قطع کے معنی ہیں کاٹنا اور تقطیع کے معنی ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے ہیں۔ اسی سے لفظ مقطع مشتق ہے۔ چنانچہ حروفِ مقطعات وہ حروف ہیں جنہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے پڑھا جاتا ہے۔ چاہے یہ جتنے بھی حروف ہوں' انہیں الگ الگ ہی پڑھا جائے گا۔ جیسے الٓمٓ، حٰمٓ، عٓسٓقٓ، کٓھٰیٰعٓصٓ۔

حروفِ مقطّعات کے بارے میں چند حقائق

جہاں تک ان حروف کے معانی و مفہوم کا تعلق ہے اس بارے میں قطعی اور یقینی طور پر کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ گویا یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مابین ایک راز ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین نے اس بارے میں کچھ آراء قائم کی ہیں' لیکن ان میں سے کسی رائے کو ماننا ہمارے لیے ضروری نہیں۔ ظاہر ہے جو بات حضور ﷺ سے مروی ہوگی اسے ہم بلا حیل و حجت مانیں گے۔ جیسے حضور ﷺ نے فرمایا کہ سورۂ یٰسٓ قرآن مجید کا قلب ہے۔ آپؐ کا یہ فرمان ہماری سمجھ میں آئے تو بھی ہم مانیں گے اور اگر سمجھ میں نہ آئے تب بھی مانیں گے۔ لیکن حضور ﷺ کے علاوہ کسی اور کا یہ مقام نہیں کہ اس کی رائے کو ہم بلا سوچے سمجھے قبول کرنے پر مجبور ہوں۔ البتہ بعض مفسرین نے ان حروف سے متعلق کچھ ایسی معلومات بھی اخذ کی ہیں جو ''حقائق'' (facts and figures) کے درجے میں آتی ہیں۔ ایسے حقائق کی اشاعت و ترویج اس لیے مفید ہے کہ اس سے قرآن مجید کے بارے میں پڑھے لکھے لوگوں کے ذوقِ تحقیق و تدبّر کو مہمیز ملتی ہے۔ چنانچہ ان میں سے چند اہم حقائق کا ذکر درج ذیل سطور میں کیا جا رہا ہے:

(۱) ۱۱۴ سورتوں میں سے کُل ۲۹ سورتوں کے آغاز میں حروفِ مقطعات آئے ہیں۔ ایک رائے کے مطابق عربی حروفِ تہجی کی تعداد بھی ۲۹ ہے۔

(۲) کُل حروفِ تہجی میں سے صرف آدھے حروف قرآن مجید میں حروفِ مقطعات کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ واضح رہے کہ عربی کے بنیادی حروفِ تہجی ۲۸ ہیں۔ البتہ جو اہلِ نحو اور اہلِ لغت ''ا'' اور ''ء'' کو الگ الگ حروف مانتے ہیں ان کے نزدیک حروفِ تہجی کی تعداد ۲۹ ہے۔ بہرحال کل حروفِ تہجی میں سے ۱۴ حروف قرآن مجید میں حروفِ مقطعات کے طور پر آئے ہیں اور ۱۴ (یا ۱۵) حروف استعمال نہیں ہوئے۔ اس حوالے سے خصوصی طور پر امام رازیؒ نے بہت دلچسپ حقائق کی نشاندہی کی ہے۔ ان کے نزدیک حروفِ تہجی کی تختی کے پہلے' درمیانی

اور آخری حصے میں سے حروف کا بطور حروفِ مقطعات استعمال ایک خاص تناسب اور ترتیب سے ہوا ہے۔ اس بنیاد پر انہوں نے حروفِ تہجی کی تختی (ا ب ت ث) کو تین حصوں میں یوں تقسیم کیا ہے کہ پہلے اور آخری حصے میں نو نو اور درمیانی حصے میں دس حروف (۹+۱۰+۹=۲۸) رکھے ہیں اور پھر اس تقسیم کی بنیاد پر درج ذیل نتائج اخذ کیے ہیں:

(i) پہلے ۹ حروف میں سے صرف دو حروف (ا اور ح) بطور حروفِ مقطعات استعمال ہوئے ہیں اور سات حروف استعمال نہیں ہوئے۔

(ii) آخری ۹ حروف میں سے سات حروف بطور حروفِ مقطعات استعمال ہوئے ہیں، جبکہ دو حروف (ف اور و) استعمال نہیں ہوئے۔

(iii) درمیانی دس حروف کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ یہ تمام حروف جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ ہر جوڑے میں ایک حرف خالی ہے جبکہ دوسرا حرف نقطوں والا ہے۔ ان تمام (پانچ) جوڑوں کے تمام خالی حروف (ر، س، ص، ط اور ع) بطور حروف مقطعات استعمال ہوئے ہیں، جبکہ نقطوں والے حروف (ز، ش، ض، ظ اور غ) استعمال نہیں ہوئے۔

(۳) سورتوں اور حروف مقطعات کی تعداد کے حوالے سے درج ذیل حقائق سامنے آتے ہیں:

(i) تین سورتوں کے شروع میں ایک ایک حرف آیا ہے:

صٓ ﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ ①﴾ (صٓ)

قٓ ﴿قٓ ۫ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ ①﴾ (قٓ)

نٓ ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ ①﴾ (القلم)

(ii) نو سورتوں کے شروع میں دو دو حروف آئے ہیں۔

طٰهٰ، طٰسٓمٓ (النمل) یٰسٓ، حٰمٓ (المؤمن، حٰمٓ السجدة، الزخرف، الدخان، الجاثیة، الاحقاف)

(iii) تیرہ سورتوں کے شروع میں تین تین حروف آئے ہیں:

الٓمٓ (البقرة، آل عمران، العنکبوت، الروم، لقمان، السجدة)

الٓرٰ (یونس، هود، یوسف، ابراهیم، الحجر)

طٰسٓمٓ (الشعراء، القصص)

(iv) دوسورتوں کے شروع میں چار چار حروف آئے ہیں:

الٓمّٓصٓ (الاعراف) ' الٓمّٓرٰ (الرعد)

(v) دوسورتوں کے شروع میں پانچ پانچ حروف آئے ہیں:

كٓهٰيٰعٓصٓ (مریم) ' حٰمٓ ① عٓسٓقٓ (الشوریٰ)

ان اعداد کے اندر بھی ضرور کوئی نہ کوئی معنویت پنہاں ہوگی۔ ممکن ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس حوالے سے نئے حقائق بھی منکشف ہوں۔ جہاں تک ان حروف کے معانی و مفہوم کا تعلق ہے اس ضمن میں قبل ازیں وضاحت کی جا چکی ہے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مابین راز ہے۔ البتہ بعض مفسرین نے ان کے مفہوم کے بارے میں کچھ آراء قائم کی ہیں۔ ان میں سب سے اہم اور معتبر آراء حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ہیں' لیکن یہ ان کی ذاتی آراء ہیں۔ اس لیے مفسرین نے جہاں حضرت ابن عباسؓ کی ان آراء کا ذکر کیا ہے وہاں یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ آپؓ کی ان آراء کے پیچھے کوئی قاطع دلیل (حضور ﷺ کے فرمان یا کسی اصولِ لغت کی شکل میں کوئی ٹھوس حوالہ) نہیں ہے' لیکن قرآن مجید کی تفسیر کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی رائے بذاتِ خود بھی بہت معتبر مانی جاتی ہے۔ اس لیے کہ حضور ﷺ نے آپؓ کے لیے خصوصی دعا فرمائی تھی: ((اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاْوِيْلَ))(۱) کہ اے اللہ! اس نوجوان کو دین کا فہم اور تاویل القرآن کا علم (قرآن کے مفہوم کو سمجھنے کی خاص استعداد) عطا فرما۔ ظاہر ہے جس صحابی کے بارے میں حضور ﷺ نے خصوصی طور پر دعا فرمائی ہو' وہ دوسرے صحابہؓ میں ایک طرح سے ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ علم تفسیر میں سند مانے جاتے ہیں اور اسی وجہ سے آپؓ حِبْرُ الْاُمَّة (اُمت کے سب سے بڑے عالم) کے لقب سے مشہور ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حروفِ مقطعات کو جملوں کا مخفف قرار دیا ہے۔ مثلاً الٓمّٓ ان کے نزدیک اَنَا اللّٰهُ اَعْلَمُ (میں اللہ ہی سب سے زیادہ جاننے والا ہوں) کا مخفف ہے۔ گویا ان کی رائے کے مطابق تین الفاظ پر مشتمل اس جملے کے پہلے لفظ اَنَا کا پہلا حرف (ا)' درمیانی لفظ اللّٰه کا درمیانی حرف (ل) اور آخری لفظ اَعْلَمُ کا آخری حرف (م) مل کر الٓمّٓ

(۱) مسند احمد ۱/۵۴۰، ح: ۳۰۲۴، مکتبہ دار احیاء التراث العربی۔

بنا ہے۔اسی طرح سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے تقریباً تمام حروفِ مقطعات کے جملے بنائے ہیں —— یٰسٓ کو انہوںؓ نے یَا اِنسَانُ کا مخفف بتایا ہے۔یعنی کہ لفظ ''انسان'' کا درمیانی حرف ''س'' اس لفظ کی نمائندگی کر رہا ہے۔اس بارے میں ایک دلیل یہ بھی دی گئی ہے کہ حبشہ اور قبیلہ طے کی لغت میں انسان کو س ہی کہا جاتا تھا —— ظاہر ہے عرب کے مختلف قبائل کی اپنی اپنی بولیاں تھیں' جیسے ہمارے ہاں پنجاب کے ہر علاقہ کا اپنا لہجہ اور اپنی لغت ہے۔اس کے علاوہ یہ دلیل اپنی جگہ اس لیے بھی معقول محسوس ہوتی ہے کہ کسی لفظ کا کوئی ایک حرف بول کر متعلقہ لفظ مراد لینے کا انداز بعض دوسری زبانوں میں ملتا ہے۔مثلاً پنجابی میں نمک کو ''نون'' (لفظ نمک کا پہلا حرف جو عوامی لہجے میں اب ''لون'' بن چکا ہے)۔اور ''لڑائی'' کو ''ل'' (لام) کہا جاتا ہے۔اسی معنی کے حوالے سے سیز فائر (cease fire) کے لیے پنجابی میں ''لام بندی'' کی ترکیب استعمال ہوتی ہے۔چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی رائے میں یٰسٓ یَا اِنسَانُ کا مخفف ہے اور انسان سے مراد یہاں انسانِ کامل یعنی محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔اس بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہاں ''س'' سید کا مخفف ہے اور اس طرح یٰسٓ کے معنی ہیں: یَاسَیِّد یعنی اے انسانوں کے سردار۔بہرحال اس سورت کی ابتدائی آیات کے انداز اور مفہوم سے از خود واضح ہوتا ہے کہ یہاں یٰسٓ کے کلمہ سے حضور ﷺ سے خطاب ہے: ﴿یٰسٓ ① وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ② اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ③﴾ —— بالکل یہی انداز سورۂ طٰہٰ کے آغاز میں بھی نظر آتا ہے: ﴿طٰهٰ ① مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ②﴾۔یعنی اس میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ ان دونوں سورتوں کے آغاز میں محمد رسول اللہ ﷺ سے براہِ راست خطاب ہے۔یہی وجہ ہے کہ بعض حضرات یٰسٓ اور طٰہٰ کو بھی حضور ﷺ کے اسمائے مبارک میں شمار کرتے ہیں۔بقول اقبال:۔

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں' وہی فرقاں' وہی یاسیں' وہی طاہا

حروفِ مقطعات کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ سورتوں کے ناموں کے طور پر نازل ہوئے ہیں۔لیکن یہ رائے بھی جزوی طور پر ہی درست ہو سکتی ہے' ایک مستقل قاعدہ کے طور پر درست نہیں مانی جا سکتی۔مثلاً یٰسٓ اور طٰہٰ تو واقعی سورتوں کے نام ہیں' لیکن الٓمٓ کسی

سورت کا نام نہیں ہوسکتا' کیونکہ یہ حروف چھ سورتوں کے آغاز میں نازل ہوئے ہیں۔ اب اگر ان سب سورتوں کو الٓمٓ کے نام سے موسوم کر دیا جائے تو ان سب کی انفرادیت ہی ختم ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کسی چیز کا نام تو اس چیز کی انفرادیت واضح کرنے کے لیے رکھا جاتا ہے۔

آیت ۲ ﴿وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝۲﴾ ''قسم ہے اس قرآن کی جو نہایت حکمت والا ہے۔''

یعنی پُر از حکمت قرآن کی قسم ہے —— یہاں پر ایک نکتہ یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ قرآن مجید کی جن سورتوں کا آغاز حروفِ مقطعات سے ہوتا ہے ان میں سے اکثر کے آغاز میں قرآن مجید کی عظمت کا بیان ہے' خصوصی طور پر الٓمٓ' الٓرٰ اور حٰمٓ کے سلسلوں کی سورتوں کے آغاز میں قرآن حکیم کی عظمت کا ذکر بہت نمایاں ہے۔ جیسے:

﴿الٓمّٓ ۝۱ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ (البقرۃ)

﴿الٓرٰ ۣ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝۱﴾ (یونس)

﴿حٰمٓ ۝۱ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝۲﴾ (المؤمن)

اسی طرح حروفِ مقطعات سے شروع ہونے والی درج ذیل تین سورتوں کے آغاز میں قرآن مجید کی (صفات کی) قسم کھائی گئی ہے۔

(i) سورۂ یٰسٓ: ﴿يٰسٓ ۝۱ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝۲﴾ ''حکمت والے قرآن کی قسم!''

(ii) سورۂ صٓ: ﴿صٓ ۣ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ ۝۱﴾ ''نصیحت اور موعظت والے قرآن کی قسم!''

(iii) سورۂ قٓ: ﴿قٓ ۣ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝۱﴾ ''بزرگی والے قرآن کی قسم!''

قسم کا مقصود: شہادت

قسم کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے کہ ہم انسانوں کے ہاں قسم عام طور پر شہادت اور گواہی کے لیے کھائی جاتی ہے۔ یعنی جب میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا مخاطب میری بات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تو میں کہتا ہوں خدا کی قسم میں درست بات کہہ رہا ہوں۔ گویا میں نے اپنی بات میں وزن اور زور پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کو گواہ بنایا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر جان کر یہ بات کہہ رہا ہوں۔ اسی طرح بعض لوگ کوئی وعدہ یا معاہدہ کرتے ہوئے بھی اللہ کی قسم کھاتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے وہ دراصل فریق ثانی کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ اَللّٰهُ شَهِيْدٌ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ کہ اللہ تعالیٰ اس معاہدے پر ہمارے اور تمہارے درمیان گواہ ہے۔

البتہ اللہ تعالیٰ کے قسم کھانے اور انسانوں کے قسم کھانے میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ انسان جب قسم کھاتے ہیں تو انہیں اپنی بات یا گواہی میں وزن پیدا کرنے کے لیے کسی عظیم ہستی کی قسم کھانا پڑتی ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات تو خود عظیم ترین ہے، اُس کے علاوہ باقی ہر چیز اُس کی مخلوق ہے۔ اس لیے جب اللہ تعالیٰ فجر کی، زمانے کی، ہواؤں کی، یعنی اپنی مخلوق میں سے کسی چیز کی قسم کھاتا ہے تو اس سے صرف گواہی مقصود ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو قسم کھا کر کسی چیز کی افادیت یا عظمت نمایاں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی قسموں کے حوالے سے متعلقہ اشیاء یا مقامات میں افادیت اور عظمت کے خصوصی پہلو تلاش کرنے کے لیے بے کار محنت صرف نہیں کرنی چاہیے۔ مثلاً اگر اللہ تعالیٰ نے انجیر (وَالتِّيْنِ) کی قسم کھائی ہے تو بہت سے لوگوں نے انجیر کے مثبت خواص، انسانی صحت کے لیے اس کی خصوصی افادیت اور اس قسم کے حوالے سے ممکنہ مصلحتیں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں تو بہر حال کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کسی مخلوق کا وجود بھی حکمت سے خالی نہیں، حتیٰ کہ گھاس کے تنکے کی بھی اپنی اہمیت ہے۔ نہ معلوم گھاس کے ایک تنکے میں کیا کیا خواص پائے جاتے ہیں جنہیں ہم جانتے ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ (ابراهيم: ٣٤، النحل: ١٨) کہ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو گے تو کبھی ان کا احصاء نہ کر سکو گے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق کا وجود اپنی جگہ پر اس کی نشانی بھی ہے: ﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿١٩٠﴾﴾ (آل عمران) ”یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں ہوش مند لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔“

چنانچہ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق میں افادیت اور عظمت کا کوئی نہ کوئی پہلو تو موجود ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی قسموں کے حوالے سے یہ نکتہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے التِّيْن، الزَّيْتُوْن، طُوْرِ سِيْنِيْن اور البَلَدُ الْاَمِين یا اپنی مخلوق میں سے بہت سی دوسری چیزوں کی قسمیں کھائی ہیں تو ان قسموں سے ان چیزوں یا مقامات کی محض گواہی مقصود ہے۔ لہٰذا ہمیں اللہ تعالیٰ کی قسم کے حوالے سے متعلقہ چیزوں میں عظمت کے خصوصی پہلو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ صرف گواہی کا پہلو مدِّنظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ قسم کے حوالے سے بنیادی اہمیت کی دوسری بات یہ مدِّنظر رکھنی چاہیے کہ قسم کس چیز پر یا کس لیے کھائی گئی ہے؟

جیسے آیت زیر مطالعہ میں قرآن حکیم کی قسم جس حقیقت پر کھائی گئی ہے' اس کا ذکر اگلی آیت میں آیا ہے کہ:

آیت ۳ ﴿اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۳﴾ ''(اے محمد ﷺ) یقیناً آپ رسولوں میں سے ہیں۔''

یہ ہے وہ حقیقت جسے اجاگر کرنے کے لیے یہاں قرآن مجید کی قسم کھائی گئی ہے۔ گویا محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر سب سے بڑی دلیل' سب سے بڑی شہادت اور گواہی خود قرآن مجید ہے۔

حضور ﷺ کا اصل معجزہ: قرآنِ حکیم

اس حقیقت کو اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ حضور ﷺ کا اصل اور سب سے بڑا معجزہ قرآن حکیم ہے۔ حضور ﷺ سے پہلے بھی انبیاء و رسل علیہم السلام کو ایک سے بڑھ کر ایک عظیم معجزات عطا کیے گئے۔ مثلاً حضرت مسیح علیہ السلام کے مُردوں کو زندہ کر دینے اور گارے سے پرندے بنا کر زندہ کر دینے کے معجزات (یہ انسانی سطح پر احیائے موتیٰ اور خلق حیات کے حوالے سے عظیم ترین معجزات تھے)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا اور یدِ بیضا کے معجزات اور حضرت صالح علیہ السلام کا اونٹنی کا معجزہ — بلاشبہ اپنی اپنی جگہ پر یہ عظیم ترین معجزات تھے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مذکورہ تمام معجزات حسّی (ظاہری طور پر محسوس کیے جانے والے) اور وقتی (یعنی متعلقہ رسول کی زندگی کے ساتھ مشروط) تھے۔ مثلاً یدِ بیضا کے معجزے کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات اور زندگی کے ساتھ تھا۔ عصاء بھی صرف آپؑ ہی کے ہاتھ میں معجزہ تھا۔ آج اگر آپؑ کا عصا دنیا میں کہیں موجود ہے تو وہ محض ایک مقدس لکڑی ہے۔ البتہ حضور ﷺ کو قرآن حکیم کی صورت میں جو معجزہ عطا ہوا ہے یہ دو اعتبارات سے باقی تمام معجزات سے افضل ہے۔ ایک یہ کہ یہ محض حسّی نہیں بلکہ معنوی معجزہ ہے۔ یعنی قرآن مجید کی معجزانہ حیثیت کے عرفان و اثبات کا تعلق ظاہری آنکھوں (بصارت) سے زیادہ ذہن و قلب کی آنکھوں (بصیرت) سے ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ وقتی نہیں بلکہ دائمی معجزہ ہے۔ جس طرح حضور ﷺ کی رسالت ابدی و دائمی ہے' اسی طرح آپؐ کا یہ معجزہ بھی قیامت تک کے لیے قائم و دائم ہے۔ اس لیے میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ حضور ﷺ کا اصل معجزہ قرآن حکیم ہے (میرے اس جملے میں لفظ ''اصل'' بنیادی اور خصوصی اہمیت کا حامل ہے)۔ ظاہر ہے ہر نبیؑ اور ہر رسولؑ کا اصل معجزہ تو وہی ہوتا ہے جسے وہ اپنے مخالفین

کے سامنے چیلنج کے ساتھ پیش کرے کہ آؤ اس کا مقابلہ کر کے دکھاؤ۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا کے ساتھ مقابلے کے لیے جادوگروں کو چیلنج کیا تھا۔ چنانچہ قرآن مجید حضور ﷺ کا وہ معجزہ ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے رہتی دنیا تک کے لیے نوعِ انسانی کو چیلنج کیا ہے کہ اگر کوئی اس کی نظیر پیش کر سکتا ہے تو کر کے دکھائے۔

ہمارے ہاں بعض لوگ حضور ﷺ کے اس عظیم الشان معجزے کے بجائے آپ کی ذات سے ظاہر ہونے والے خوارقِ عادت واقعات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اس میں تو بہرحال کوئی شک نہیں کہ حضور ﷺ کا ہر معجزہ عظیم اور بابرکت ہے۔ مثلاً آپؐ کے دست مبارک کی برکت سے تھوڑا سا کھانا بہت سے لوگوں کے لیے کافی ہو گیا۔ مسجد نبویؐ میں حضور ﷺ خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے کھجور کے ایک سوکھے تنے کے ساتھ ٹیک لگایا کرتے تھے۔ یہ لکڑی اسی مقصد کے لیے اس جگہ پر گاڑی گئی تھی۔ جب منبر بن گیا تو آپ ﷺ نے اس کے ساتھ ٹیک لگانا چھوڑ دیا۔ اس پر وہ سوکھی لکڑی بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کے رونے کی مخصوص آواز موقع پر موجود سب صحابہؓ نے سنی۔ بہرحال حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس سے ایسے خوارقِ عادت واقعات تو بے شمار ظہور پذیر ہوئے، لیکن قرآن مجید کا معجزہ ان معجزات کے مقابلے میں بہت عظیم ہے۔ اس لیے کہ خرقِ عادت واقعات (کرامات) کا ظہور تو اولیاء اللہ سے بھی ہوتا ہے۔ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ مسجد نبویؐ میں خطبہ دیتے ہوئے اچانک شام کے محاذ پر مصروفِ جہاد مسلمان سپہ سالار حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ کو ہدایت دینے لگے تھے: ''یَا سَارِیَةُ! اَلْجَبَلَ الْجَبَلَ!![1]'' کہ اے ساریہؓ پہاڑ کی طرف ہو جاؤ! بعد ازاں استفسار پر آپؓ نے بتایا کہ خطبہ کے دوران میں شام کا محاذ اچانک میری نظروں کے سامنے آ گیا اور میں نے دیکھا کہ دشمن اسلامی لشکر پر حملہ کرنے کو ہے۔ چنانچہ میں نے اس بارے میں سپہ سالار کو آگاہ کیا کہ اپنی فوج کو پہاڑ کی طرف کر لیں۔ بعد میں حضرت ساریہؓ نے بھی تصدیق کی کہ متعلقہ مخصوص موقع پر انہوں نے حضرت عمرؓ کی آواز سنی اور فوراً آپؓ کی ہدایات پر عمل کیا۔ گویا اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اپنے کسی دوست کے ذریعے سے اپنی کسی خاص حکمت کو ظاہر فرما دیتا ہے۔ تو حضور ﷺ کے بے شمار حسی معجزات بلاشبہ اپنی جگہ عظیم اور برحق ہیں، لیکن آپ کا اصل (یہاں

(۱) سلسلة الاحاديث الصحيحة للالبانی، ح: ۱۱۱۰۔ تاریخ الاسلام للذهبی: ۳۸۴/۱۔

لفظ ''اصل'' کو خط کشیدہ یعنی underline سمجھیں) معجزہ قرآن حکیم ہے۔ چنانچہ اس سیاق وسباق میں ان آیات ﴿وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝۲ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۳﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ اے نبی (ﷺ!) یہ حکمت بھرا قرآن شاہد ہے، ہمارا یہ عظیم الشان کلام برہان اور دلیل قاطع ہے اس حقیقت پر کہ آپؐ ہمارے رسولوں میں سے ہیں۔ یعنی آپؐ یقیناً اللہ کے رسولؐ ہیں۔

قرآن کا اصل اعجاز: حکمت

یہاں آیت ﴿وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝۲﴾ کے حوالے سے یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ قرآن مجید کے اعجاز کے بے شمار پہلو ہیں۔ ''وجوہ اعجاز القرآن'' پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں کہ قرآن مجید کس کس اعتبار اور کن کن پہلوؤں سے معجزہ ہے۔ لیکن اس کا اصل اعجاز اس کی حکمت ہے۔ دراصل مختلف زمانوں اور مختلف حالات میں قرآن مجید کے اعجاز کے مختلف پہلو نمایاں ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً نزولِ قرآن کے زمانہ میں عربوں کو قرآن مجید کے جس اعجاز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اس کلام کے ظاہری محاسن تھے۔ بلکہ اس حوالے سے اصل حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت، الفاظ کی ندرت، تراکیب کی چستی، اس کے صوتی آہنگ کی حلاوت اور ایسے ہی بے شمار لسانی و ادبی محاسن کے سامنے وہ لوگ مبہوت ہو کر رہ گئے تھے جو اپنے علاوہ پوری دنیا کے لوگوں کو ''گونگا'' سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ مختلف ادوار میں قرآن مجید کی بہت سی پیشین گوئیاں بھی اپنی جگہ عظیم معجزات ثابت ہوئیں۔ مثلاً سورۃ الروم کے آغاز میں بیان کی گئی یہ پیشین گوئیاں چند ہی سالوں میں حرف بحرف درست ثابت ہوئیں: ﴿غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝۲ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝۳ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۭ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۴﴾ ''رومی مغلوب ہو گئے، قریب کی سرزمین میں۔ اور وہ اپنی اس مغلوبیت کے بعد عنقریب غالب آجائیں گے، چند سالوں میں۔ اللہ ہی کا اختیار ہے، پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اور اُس دن اہل ایمان خوشیاں منا رہے ہوں گے''۔ گنتی کے اعتبار سے عربی لفظ بِضْع کا اطلاق دس سے کم کے اعداد پر ہوتا ہے۔ چنانچہ ان آیات کے نزول کے ۹ سال بعد یہ دونوں پیشین گوئیاں من وعن درست ثابت ہوگئیں۔ رومی بھی ایرانیوں پر دوبارہ غالب آ گئے اور اہلِ ایمان کو بھی اللہ تعالیٰ کی مدد سے مشرکینِ مکہ پر میدانِ بدر میں شاندار فتح نصیب ہوئی —— بہرحال اعجاز القرآن

کے بے شمار پہلو ہیں' لیکن اس کا اصل اور سب سے بڑا اعجاز اس کی حکمت' دانائی' اس کا فلسفہ اور اس کی وہ تعلیمات ہیں جن کے ذریعے سے انسانی عقل وفکر کو زندگی کے رموز اور کائنات کے حقائق تک پہنچنے کے لیے راہنمائی میسّر آئی۔

قرآن مجید کے ظاہری محاسن کی خوبصورتی اور اس کی حکیمانہ تعلیمات کی اہمیت کی مثال دراصل ایک پھل کے خول اور اس کے گودے کی سی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک نارنگی کی ظاہری رنگت' رعنائی' خوشبو وغیرہ خوبیاں بھی قابل تعریف ہیں' لیکن نارنگی کی اصل حقیقت تو اس کے خول کے اندر ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کے ترشے ہوئے ہیروں جیسے الفاظ' اس کی خوبصورت اور نادر تراکیب' اس کے جملوں کا صوتی آہنگ' اس کی عبارت کا ردھم (rythm)' اس کے لہجے کی حلاوت اور اس کے بہت سے دوسرے ادبی ولسانی محاسن یقیناً فصاحت و بلاغت کی معراج ہیں' لیکن قرآن مجید کی اصل حقیقت اس کی حکیمانہ تعلیمات میں ہے' جن کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾ (بنی اسرائیل:۳۹) ''کہ اے نبی (ﷺ) یہ ہیں وہ چیزیں جو آپ کے رب نے آپ پر نازل کی ہیں از قسم حکمت۔''

ایک اہم نکتہ کی وضاحت

آیات زیر مطالعہ ﴿وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝﴾ کے حوالے سے یہ نکتہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ یہاں حضور ﷺ کو اس قدر پُرزور انداز میں کیوں بتایا اور سمجھایا جا رہا ہے کہ آپؐ واقعی اللہ کے رسول ہیں۔ کیا حضور ﷺ کو اپنی نبوت و رسالت کے بارے میں' معاذ اللہ' کوئی شک وشبہ ہو سکتا تھا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ دراصل ایک ایسا اسلوب ہے جس میں خطاب کسی اور سے ہوتا ہے اور سنانا کسی اور کو مقصود ہوتا ہے۔ یہ اسلوب ہم انسانوں کے ہاں بھی عام پایا جاتا ہے' بلکہ ہمارے ہاں تو گھروں میں اس مفہوم کی کہاوتیں بھی مشہور ہیں اور عملی طور پر بھی ایسا ہوتا ہے کہ جو بات بہو سے کہنا مقصود ہو وہ بیٹی کو مخاطب کر کے کہی جاتی ہے' مبادا کہ بہو براہِ راست کہنے سے برا منائے۔ چنانچہ بڑی بوڑھی خواتین اگر کسی معاملے میں گھر کی بہو کو کوئی ہدایت دینا چاہتی ہیں تو وہی ہدایت وہ عام طور پر بہو کی موجودگی میں اپنی بیٹی کو دیتی ہیں تاکہ بہو سن کر خود ہی سمجھ جائے۔ اس کے علاوہ بعض

اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص سے کسی رنجش وغیرہ کے باعث آپ براہِ راست بات نہیں کرنا چاہتے۔ ایسی صورت میں آپ اگر اپنی کوئی بات اس شخص تک پہنچانا چاہیں تو آپ وہی بات اس کی موجودگی میں اپنے کسی قریبی شخص سے مخاطب ہو کر کہہ دیتے ہیں۔ بہرحال یہاں یہ بات زوردار اسلوب میں سنانا تو ان لوگوں کو مقصود ہے جو حضور ﷺ کی نبوت و رسالت کو ماننے سے انکار کر رہے تھے' مگر ان سے بیزاری کی وجہ سے یا کسی اور حکمت کے باعث انہیں براہِ راست مخاطب کرنے کے بجائے وہی بات حضور ﷺ سے کہی جا رہی ہے۔

آیت ۴ ﴿عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝۴﴾ ''آپ سیدھے راستے پر ہیں۔''

جوابِ قسم کے حوالے سے یہ اِنَّكَ کی ''خبر دوم'' ہے کہ اے نبی ﷺ یہ حکمت والا قرآن گواہ ہے کہ آپ صراطِ مستقیم پر ہیں۔ (خبر اوّل ہم گزشتہ آیت میں پڑھ آئے ہیں کہ اے نبی آپ یقیناً رسولوں میں سے ہیں۔)

فطرتِ انسانی میں صراطِ مستقیم کی پہچان

صراطِ مستقیم وہ سیدھی راہ ہے جس کی طلب فطرتِ انسانی کے اندر موجود ہے۔ چنانچہ اگر کوئی انسان عقلِ سلیم کا حامل ہے اور اس کی فطرت بھی صحیح ہے تو اس راستے کی چند ابتدائی منازل وہ بغیر کسی خارجی راہنمائی کے بھی طے کر سکتا ہے۔ مثلاً وہ اپنی فطرتِ سلیمہ کی فراہم کردہ ہدایت اور بصیرت کی مدد سے اللہ تعالیٰ کو بھی پہچان سکتا ہے' توحید کی حقیقت کو بھی جان سکتا ہے' آخرت کی ضرورت کا شعور بھی اسے حاصل ہو سکتا ہے اور اس کے دل میں یہ یقین بھی جاگزیں ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کا راستہ ہی اس کے لیے درست اور سیدھا راستہ ہے۔ انسانی فطرت کی اس ہدایت کا عکس سورۃ الفاتحہ کی ان آیات میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾ ''کُل شکر اور کُل ثنا اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے''۔ ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝﴾ ''بہت رحم فرمانے والا' نہایت مہربان''۔ ﴿مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝﴾ ''جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار''۔ ﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝﴾ ''(اے اللہ!) ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے اور ہم صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہتے رہیں گے۔''

گویا یہ ہدایت کی وہ آخری منزل ہے جہاں تک کسی انسان کی فطرتِ سلیمہ اس کی

راہنمائی کر سکتی ہے۔ اس سے آگے بطور خود انسان کچھ نہیں جانتا کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ زندگی کے سفر میں قدم قدم پر اسے دوراہے اور چوراہے نظر آتے ہیں۔ ان بھول بھلیوں کے درمیان چلتے ہوئے اسے کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرے اور کس راستے سے دور رہے۔ اس کی فطرت نے اسے یہ تو بتا دیا کہ اللہ اس کا خالق' مالک اور معبود ہے' اسے صرف اور صرف اُسی کی عبادت کرنی ہے۔ مگر یہ عبادت کیسے کرنی ہے؟ اس کے لیے اسے کیا کرنا ہے؟ کون سا طریقہ اپنانا ہے؟ اور کون سا راستہ اختیار کرنا ہے؟ اس بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں۔ لہٰذا اس مقام پر اسے گھٹنے ٹیک کر اپنے اللہ اور معبود سے درخواست کرنی پڑتی ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ ''(اے ہمارے رب!) ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما۔'' کہ اے اللہ! ہمیں تیری ذات کا عرفان بھی حاصل ہو چکا ہے' ہم تیری توحید کو بھی پہچان گئے ہیں۔ ہم یہ بھی سمجھ چکے ہیں کہ تو ہی رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہے۔ مرنے کے بعد تیرے حضور حاضری اور آخرت کی جزا و سزا کے بارے میں بھی ہمیں یقین حاصل ہو چکا ہے۔ ہم اس حقیقت سے بھی آگاہ ہو چکے ہیں کہ تیری ''بندگی'' کا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے۔ مگر ہمیں اس راستے کے خدوخال کی پہچان نہیں۔ زندگی کا میدان طرح طرح کی پر پیچ پگڈنڈیوں سے اٹا پڑا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم انجانے میں کوئی غلط موڑ مڑ جائیں۔ اس لیے ہم تجھ سے ہدایت اور راہنمائی کی درخواست کرتے ہیں۔ تو اے ہمارے رب! تو ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت دیے رکھ۔

چنانچہ یہاں پر حضور ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا کہ اے نبی ﷺ آپ بلاشبہ سیدھے راستے پر ہیں۔ اس ایک جملے میں ایک طرف آپ ﷺ کے مخالفین اور آپؐ کی نبوت و رسالت کے منکرین پر واضح کر دیا گیا کہ صرف آپؐ کا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے اور دوسری طرف طالبانِ ہدایت کی راہنمائی بھی فرما دی گئی کہ جس کسی کو ہدایت مطلوب ہو' وہ محمد رسول اللہ ﷺ کے دامن سے وابستہ ہو جائے۔ اس لیے کہ آپؐ کے نقش قدم پر چلنے کا نام ہی صراطِ مستقیم ہے۔ اس لحاظ سے ان دو آیات ﴿اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝٣ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝٤﴾ کا انداز سورۃ البقرۃ کی آیت ﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝٥﴾ سے ملتا جلتا ہے۔

.....دیں ہمہ اوست!

آیت زیر مطالعہ ہمارے لیے یہ خصوصی رہنمائی بھی فراہم کرتی ہے کہ اگرچہ قرآن مجید سراسر حکمت ہے' بلاشبہ انسانی زندگی سے متعلقہ تمام تر دانائی (wisdom) اور فلسفہ اس میں موجود ہے' مگر صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے ہم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی پیروی کے محتاج اور آپؐ کے نقشِ قدم کو دیکھنے پر مجبور ہیں۔ گویا ﴿عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝۴﴾ کے الفاظ یہ حقیقت واضح کر رہے ہیں کہ دین کی عملی تشکیل سنت رسول ﷺ کی بنیاد پر ہوگی۔ اور یہ کہ دین صرف قرآن نہیں ہے۔ ظاہر ہے قرآن مجید سے محبت رکھنا' اس کے حقوق کی ادائیگی کے لیے محنت کرنا' اس کا پڑھنا' سیکھنا اور سکھانا' سب کچھ اپنی اپنی جگہ پر بہت اہم' ضروری' قیمتی اور الحق ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان: ((خَیْرُکُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ))(۱) بھی حق ہے۔ لیکن قرآن کی عقیدت و محبت میں اگر کسی شخص نے یہ سمجھ لیا کہ دین کے حوالے سے بس قرآن ہی سب کچھ ہے اور یہ کہ صرف قرآن ہی اس کی ہدایت کے لیے کافی ہے اور اس خیال میں وہ سنت رسول ﷺ سے مستغنی ہو گیا تو سمجھ لیں کہ وہ گمراہ ہو گیا۔ گویا اعتدال و توازن کا دامن چھوڑ دینے سے بعض اوقات خیر بھی انسان کے لیے شر کا ذریعہ بن جاتی ہے اور نیکی و بھلائی کا جذبہ بھی برائی کی تمہید بن جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی محبت اور نیکی کے جذبے سے مغلوب ہو کر شادی نہ کرنے اور معاشرتی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو جانے کی روش اختیار کر لے تو یقیناً یہ گمراہی کا راستہ ہے' کیونکہ حضور ﷺ نے واضح فرما دیا ہے: ((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ))(۲) کہ اسلام میں رہبانیت (ترکِ دنیا کے طریقہ) کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ سورۃ الحدید (آیت ۲۷) میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کی رہبانیت کے بارے میں بھی وضاحت فرما دی ہے: ﴿وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ﴾ کہ رہبانیت کا طریقہ انہوں نے خود ایجاد کیا تھا' ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا۔ چنانچہ ان آیات کے حوالے سے ہر مسلمان کو یہ نکتہ اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ جس دین کا ماننے والا ہے اور جس دین پر وہ عمل کرنے کی کوشش کر رہا ہے وہ صرف قرآن ہی پر مبنی نہیں ہے' بلکہ اس کی بنیاد

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب فضائل القرآن' باب خیرکم من تعلم القرآن وعلمه۔

(۲) فتح الباری لابن حجر۔

قرآن' سنتِ رسول ﷺ' سنتِ خلفائے راشدینؓ' اجماع اور اُمت کے تواترِ عمل پر ہے۔ اور یہ کہ صراطِ مستقیم درحقیقت حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے نقوشِ پا کا نام ہے۔ پس ایک بندۂ مؤمن کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی میں آپ ﷺ کے نقوشِ پا کو دیکھتے ہوئے اس یقین سے چلتا چلا جائے کہ بس یہی صراطِ مستقیم ہے۔ ظاہر ہے قرآن مجید میں تو دین کا فلسفہ' اہم احکام' بنیادی اصول (اصولِ تمدن' اصولِ سیاست' اصولِ معیشت وغیرہ) بیان ہوئے ہیں۔ ان اصولوں پر مبنی کسی مربوط نظام کی تشکیل تو یقیناً سنت رسول ﷺ کی راہنمائی سے ہی طے پائے گی۔ مثلاً قرآن مجید میں نماز کا فلسفہ وحکمت' نماز سے متعلق احکام' سجدے' رکوع اور قیام کا ذکر تو ہے' مگر نماز پڑھنے کا باقاعدہ طریقہ' پنجگانہ نمازوں کے اوقات' مختلف نمازوں کی رکعتوں کی تعداد' ہر رکعت میں قیام' رکوع اور سجدے کی ترتیب جیسی تفصیلات تو ظاہر ہے قرآن مجید میں نہیں ہیں۔ لہٰذا نماز کا پورا نظام تشکیل دینے کے لیے ہم سنت رسولؐ سے راہنمائی کے محتاج ہیں۔ ظاہر ہے صرف حضور ﷺ کے بتانے سے ہی ہمیں معلوم ہوا کہ فجر کی دو رکعتیں ہیں' مغرب کی تین' جبکہ ظہر' عصر اور عشاء کی چار چار رکعتیں ہیں۔ آپ ﷺ ہی نے ہمیں بتایا کہ ہر رکعت میں پہلے قیام کرنا ہے' اس کے بعد رکوع ہے' پھر بالترتیب قومہ' سجدہ' جلسہ' دوسرا سجدہ اور قعدہ ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ہم دین کے بنیادی ستون یعنی نماز جیسے اہم فرض کی ایک رکعت کے طریق کار کا بھی تعین قرآن مجید سے نہیں کر سکتے' جس کے بارے میں قیامت کے دن بندۂ مسلمان سے پہلا سوال ہوگا:

روزِ محشر کہ جاں گداز بود　　اوّلیں پرسش نماز بود

چنانچہ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ صرف قرآن مجید ہی اس کی ہدایت کے لیے کافی ہے تو اس کا یہ دعویٰ سراسر گمراہی پر مبنی ہے۔

آیت ۵ ﴿تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝۵﴾ ''یہ تنزیل ہے عزیز اور رحیم کی۔''

یہ آیت تین الفاظ پر مشتمل ترکیب اضافی کی شکل میں ہے۔ اس کی ایک قراءت تَنْزِيْلُ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ اور ایک تَنْزِيْلِ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ بھی ہے۔ لیکن مجمع علیہ قراءت تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ہی ہے۔ تَنْزِيْلُ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ پڑھنے سے یہ ''مبتدأ'' بھی ہو سکتا ہے اور ''خبر'' بھی۔ لیکن اگر اسے تَنْزِيْلِ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ پڑھا جائے گا تو اس صورت میں تَنْزِيْلِ

قرآن حکیم کی صفت بن جائے گا اور اس حیثیت سے اس کا ربط گزشتہ آیت ﴿وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝۲﴾ کے ساتھ ہوگا کہ یہ وہ حکمت والا قرآن ہے جو تَنْزِيْلِ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ہے۔ یعنی جو اُتارا ہوا ہے عزیز اور رحیم ہستی کا۔ البتہ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ پڑھنے سے جو اشکال پیدا ہوتا ہے اس کا یہ حل تجویز کیا گیا ہے کہ کوئی فعل اس سے پہلے محذوف مانا جائے۔ ایسی صورت میں تنزیل یا تو بطور مصدر آئے گا یا محذوف فعل کے مفعول کی حیثیت سے آئے گا۔ جیسے (نُزِّلَ) تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ کہ یہ اُتارا گیا ہے ایک عزیز اور رحیم ہستی کی تنزیل کی حیثیت سے۔ اس طرح تنزیل مصدر بن جائے گا۔

نزولِ قرآن کی دو کیفیات: اِنزال اور تنزیل

نزولِ قرآن کی کیفیت کے حوالے سے قرآن مجید کی مختلف آیات میں انزال اور تنزیل دو الفاظ آئے ہیں۔ اس میں اگرچہ ایک آدھ استثناء بھی ہوگا' لیکن انگریزی محاورہ exception proves the rule کے مصداق استثناء کے ذکر سے ہی تو کسی معاملے میں کسی اصول کی تصدیق اور نشاندہی ہوتی ہے۔ ان دونوں الفاظ کا مادہ ایک (نزل) ہی ہے۔ اِنْزال بابِ افعال سے (مصدر)' جبکہ تَنْزِيل باب تفعیل سے ہے۔ مطلق نزولِ وحی کا ذکر قرآن مجید میں عام طور پر باب افعال (انزال) میں آیا ہے۔ مثلاً ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱﴾ (القدر) اور ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)۔ لیکن جہاں حضور ﷺ پر نزول کا ذکر آیا ہے وہاں اکثر ''باب تفعیل'' کے صیغے (نَزَّلَه یا نَزَّلَ بِه) آئے ہیں۔ مثلاً ﴿فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (البقرۃ:۹۷) (یہاں مصدر تنزیل ہے)۔ باب افعال میں کسی کام کو یکبارگی کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے جیسے اِعْلام کے معنی ہیں کسی کو کوئی بات یکبارگی بتا دینا۔ جبکہ باب تفعیل اپنے اندر تدریج کے معنی رکھتا ہے۔ اس باب میں جو بھی فعل آئے گا اس میں کسی کام کو رفتہ رفتہ اور درجہ بدرجہ پایہ تکمیل تک پہنچانے کا مفہوم آئے گا۔ جیسے لفظ تَعْلِیم کسی کو تدریجاً علم سکھانے کے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ انزال کے معنی ایک ہی مرتبہ دفعتاً اتارنے کے ہیں' جبکہ لفظ تنزیل میں تھوڑا تھوڑا کر کے رفتہ رفتہ اتارنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

قرآن حکیم کا اِنْزال یہ ہے کہ پورا قرآن لوحِ محفوظ سے سمائے دنیا پر یکبارگی نازل کر دیا

گیا۔ اس کے ذکر کے لیے سورۃ البقرۃ کی مذکورہ بالا آیت (آیت ۱۸۵) اور سورۃ القدر کی ابتدائی آیت میں باب افعال (اُنْزِلَ فِیْهِ اور اَنْزَلْنٰهُ) کے صیغے آئے ہیں۔ لیکن حضور ﷺ پر قرآن مجید تنزیل کی صورت میں نازل ہوا۔ کبھی چند آیات نازل ہوئیں، کبھی ایک آیت بھی نازل ہوئی، کبھی کسی سورت کا ایک حصہ نازل ہوا، اور کبھی کوئی پوری سورت نازل ہوئی (حضور ﷺ پر پہلی مکمل سورت جو نازل ہوئی وہ سورۃ الفاتحہ تھی)۔ اس طرح حضور ﷺ پر قرآن مجید کی تنزیل تقریباً بائیس (۲۲) برس میں مکمل ہوئی۔

اس آیت ﴿تَنْزِیْلَ الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ ۝۵﴾ میں اللہ تعالیٰ کے دو صفاتی نام العَزِیْز اور الرَّحِیْم آئے ہیں۔ العزیز وہ ہستی ہے جو زبردست ہو، جس کی قدرت مطلق ہو اور جس کے اختیارات کی کوئی حد نہ ہو۔ الرحیم کے معنی ایسی ہستی کے ہیں جو رحمت ہی رحمت ہو اور جس کی ذات میں دوامِ رحمت کی کیفیت موجزن ہو۔ اللہ تعالیٰ کے یہ دو اسماء اس کی دو شانوں کا مظہر ہیں۔ العزیز اللہ تعالیٰ کا وہ نام ہے جو اس کی شانِ ترہیب (ڈرانے والی) اور جلال کا مظہر ہے۔ جبکہ اسم الرَّحِیْم میں اس کی صفت ترغیب اور شانِ جمال نظر آتی ہے۔ اس شان میں مخلوق کے لیے محبت اور دلجوئی کا انداز پایا جاتا ہے۔ تو قرآن کی تنزیل اس ہستی کی طرف سے ہوئی ہے جو العزیز بھی ہے اور الرحیم بھی۔ اور یہ قرآن نازل کس لیے ہوا ہے؟

آیت ۶ ﴿لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝۶﴾ ''تاکہ (اے نبی ﷺ!) آپ خبردار کریں اُس قوم (کے افراد) کو جن کے آباء و اَجداد کو خبردار نہیں کیا گیا، پس وہ غافل ہیں۔''

حضور ﷺ کی بعثتِ خصوصی

''اس قوم'' سے مراد یہاں بنو اسماعیل ہیں۔ واضح رہے کہ حضور ﷺ کی بعثتِ خصوصی بنو اسماعیل کی طرف تھی، سورۃ الجمعہ میں انہیں ''اُمّیّین'' کہا گیا ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ (آیت ۲) ''وہی تو ہے جس نے اٹھایا اُمّیّین میں ایک رسول ان ہی میں سے''۔ جبکہ آپ ﷺ کی بعثتِ عمومی تا قیام قیامت پوری نسل انسانی کے لیے ہے، جیسا کہ سورۂ سبا کی اس آیت میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا﴾ (آیت ۲۸) ''اور (اے نبی ﷺ!) ہم نے نہیں بھیجا ہے آپ کو مگر تمام بنی نوعِ انسانی کے لیے

بشیر اور نذیر بنا کر‘‘۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ کے الفاظ مَآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ سے یہ اشکال پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ آپ ﷺ کی بعثت تو یہود (بنی اسرائیل) کے لیے بھی تھی اور نصاریٰ کے لیے بھی۔ اور ظاہر ہے یہود کی طرف مستقل انبیاء بھی آتے رہے تھے اور ان کے پاس الہامی کتابیں بھی تھیں‘ جبکہ نصاریٰ بھی حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروکار تھے۔ اس حوالے سے یہاں یہ نکتہ بھی لائق توجہ ہے کہ سورۂ یٰسٓ حضور ﷺ کے قیامِ مکہ کے تقریباً وسطی دور میں نازل ہوئی‘ جب کہ آپ ﷺ کی دعوت کا دائرہ ابھی مکہ مکرمہ اور اس کے اطراف و جوانب تک محدود تھا۔ اس سورت کے نزول تک باہر سے مکہ آنے والے یا مکہ سے باہر جانے والے لوگوں کے ذریعے مختلف قبائل اور مختلف علاقوں میں حضور ﷺ کی نبوت کا چرچا ایک خبر کے طور پر تو ضرور پہنچا تھا‘ لیکن ابھی تک آپؐ کی دعوت کے مخاطب صرف بنو اسماعیل ہی تھے جن کی طرف حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد حضور ﷺ کی بعثت تک کوئی نبی یا رسولؑ مبعوث نہیں ہوا تھا۔ اس دوران میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چھوٹے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل میں مسلسل انبیاء و رسلؑ مبعوث ہوتے رہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو خانہ کعبہ کے جوار میں جبکہ چھوٹے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کو فلسطین میں آباد کیا تھا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام بھی نبی تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے جو بنی اسرائیل کہلائے۔ ان میں سے حضرت یوسف علیہ السلام نبی تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی وساطت سے یہ لوگ مصر میں جا کر آباد ہوئے۔ وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو مصر سے نکالا۔ بعد میں یہ لوگ دوبارہ فلسطین میں آباد ہو گئے۔ اس کے بعد ان کے ہاں حضرت داؤدؑ‘ حضرت سلیمان اور حضرت زکریا سمیت بہت سے انبیاء و رسل علیہم السلام مبعوث ہوئے۔ انہیں تین کتابیں تورات‘ زبور اور انجیل دی گئیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا تعلق بھی بنی اسرائیل سے ہی تھا۔

گویا بنی اسرائیل میں تو مسلسل انبیاء و رسلؑ مبعوث ہوتے رہے‘ لیکن ۲۵۰۰ سال کے اس طویل عرصے کے دوران میں بنو اسماعیل کی طرف کوئی نبی یا رسول مبعوث نہ ہوا۔ آیت کے الفاظ مَآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ بنو اسماعیل کے ہاں نبوت و رسالت کے اسی وقفے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ اے نبی ﷺ! آپ کے اوّلین مخاطب وہ لوگ ہیں جو پشت در پشت ایک طویل

عرصے تک ہدایتِ آسمانی سے محروم رہے ہیں۔ آپؐ چونکہ انہی کی قوم کے ایک فرد ہیں اس لیے آپؐ کی اوّلین بعثت بھی انہی کی جانب ہے' اور آپؐ کا اوّلین انذار بھی انہی کے لیے ہے۔ انہی میں سے آپؐ کو ایک اُمت تیار کرنی ہے جو آپؐ کے پیغامِ انذار و تبشیر کو عام کرے گی اور جس کی وساطت سے یہ پیغام بالآخر پوری نوعِ انسانی تک پہنچے گا۔ تو حضور ﷺ کی بعثتِ خصوصی کے تحت آپؐ کا اصل خطاب بنواسماعیل سے تھا۔ آپؐ انہی میں سے تھے' قرآن مجید بھی انہی کی زبان میں نازل ہوا تھا۔ آپؐ کے اور ان کے درمیان مغائرت کا کوئی پردہ حائل نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں پر جب آخری درجے میں اتمامِ حجت ہو گیا تو ان کے ساتھ کوئی رعایت نہ برتی گئی۔ لہٰذا سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات (۹ ہجری) میں ان لوگوں کو الٹی میٹم دے دیا گیا کہ چار ماہ کے اندر اندر یا تو وہ ایمان لے آئیں یا خطہ عرب چھوڑ کر چلے جائیں' ورنہ سب کے سب قتل کر دیے جائیں گے۔ بلکہ اس ضمن میں اہلِ ایمان کو باقاعدہ احکامات بھی جاری کر دیے گئے: ﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ﴾ (التوبۃ:۵) کہ جب خصوصی مہلت کے یہ چار ماہ گزر جائیں تو ان مشرکین میں سے جس کو جہاں دیکھو قتل کر دو۔ انہیں پکڑو' گھیرو اور ہر جگہ ان کی گھات میں بیٹھو۔ واضح رہے کہ یہ حکم صرف بنواسماعیل کے لیے تھا۔ جزیرہ نمائے عرب میں اُس وقت یہود و نصاریٰ بھی آباد تھے۔ ان پر ایسی سختی نہیں کی گئی' بلکہ انہیں اختیار دے دیا گیا کہ اگر وہ اپنے پرانے دین پر قائم رہنا چاہیں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں: ﴿حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾﴾ (التوبۃ) ''بشرطیکہ وہ جزیہ ادا کریں اور (اسلامی حکومت کے) ماتحت بن کر رہیں''۔ بنواسماعیل کے مقابلے میں دوسرے لوگوں کے ساتھ اس رعایت کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ بنواسماعیل حضور ﷺ کی بعثت خصوصی کے مخاطبین تھے۔ جبکہ ان کے علاوہ تمام نسلِ انسانی کے افراد کے لیے آپؐ کا انذار آپؐ کی بعثت عمومی کے تحت تھا۔

قتلِ عام کے مذکورہ حکم کے حوالے سے ہی عکرمہؓ بن ابی جہل کے ساتھ وہ عبرت آموز واقعہ پیش آیا جس کے نتیجے میں بالآخر وہ ایمان لے آئے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ اب جزیرہ نمائے عرب میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی تو بعض دوسرے مشرکین کے ساتھ انہوں

نے حبشہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ راستے میں ان کی کشتی طوفان کی زد میں آ گئی تو کشتی میں موجود تمام لوگ (مشرکین) بے اختیار اللہ سے فریاد کرنے لگے۔ اس مشکل وقت میں نہ تو کسی کو لات کی یاد آئی' نہ کسی نے عُزیٰ کو پکارا' نہ کسی نے ہبل کی دہائی دی اور نہ ہی کسی نے منات دیوی سے مدد چاہی۔ سب کی زبانوں پر ایک اللہ کا نام تھا اور سب اسی کو مدد کے لیے پکار رہے تھے۔ اس منظر نے عکرمہ کی آنکھیں کھول دیں۔ اس جان لیوا تجربے سے گزرتے ہوئے یہ نکتہ لطیف ان کی سمجھ میں آ گیا کہ حقیقت میں انسانی فطرت کی پکار یہی (ایک اللہ کو پکارنا) ہے' جس کی دعوت ہمیں محمد (ﷺ) دے رہے ہیں۔ اور یہ کہ اس حقیقت سے انکار کر کے ہم محمد (ﷺ) کی دعوت سے ہی نہیں بلکہ اپنی فطرت کی پکار سے بھی اعراض کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ واپس آئے اور حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایمان لے آئے۔

اگر غور کیا جائے تو آیت زیر مطالعہ کے الفاظ مَآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ میں بنو اسماعیلؑ کے لیے کسی قدر رعایت اور دلجوئی کا انداز بھی نظر آتا ہے کہ اگر تم لوگ گمراہ ہوئے تھے تو اس کی ایک ٹھوس بنیاد اور منطقی وجہ تھی۔ بزبانِ غالبؔ: ''ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا''۔ یعنی کئی پشتوں سے تمہارے پاس کوئی خبردار کرنے والا (نذیر)' کوئی داعی اِلی الحق' کوئی پیغمبر اور الہامی کتاب کی صورت میں اللہ کا کوئی پیغام نہیں آیا تھا۔ یہ تمہاری گمراہی کا واقعی ایک معقول سبب تھا' مگر اب جبکہ تمہارے پاس اللہ کے مبعوث کردہ رسول آ گئے ہیں تو اب تم انؐ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے راہِ راست پر آ جاؤ۔ یہ وہی انداز ہے جیسے بے راہ روی کے شکار کسی نوجوان کے بزرگ اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم بری صحبت کی وجہ سے غلط عادتوں کا شکار ہو گئے تھے' اب جبکہ نیک و بد کے بارے میں تم سب کچھ جان چکے ہو تو اب ہمت کرو اور اس دلدل سے نکلنے کی کوشش کرو۔

﴿فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝۶﴾ ''پس وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔''

''فَ'' یہاں پر تاکید اور نتیجہ کے ذکر کے لیے آیا ہے۔ یعنی صدیوں سے چونکہ ان لوگوں کے پاس کوئی نبی یا رسول نہیں آیا تھا اس لیے یہ لوگ بڑی شدید گمراہی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ واضح رہے کہ یہاں غٰفِلُوْنَ بطور اسم فاعل آیا ہے اور عربی زبان میں جب کوئی فعل اسم فاعل کی صورت میں آتا ہے تو اس کے معنی میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہاں غٰفِلُوْنَ کا

مفہوم یوں ہوگا کہ ان لوگوں کی غفلت کے پردے بہت دبیز ہیں' گمراہی وضلالت میں یہ لوگ بہت دور جا چکے ہیں اور حقائق کی دنیا سے ان کا ذہنی رشتہ بالکل ہی منقطع ہو چکا ہے۔

دوسری طرف آیت کے اس جملے میں بالواسطہ طور پر حضور ﷺ کو یہ پیغام بھی دیا جا رہا ہے کہ اس قوم کے حوالے سے آپؐ کے ذمے بہت بھاری کام آن پڑا ہے۔ اگر تو کسی قوم میں ہدایت کا کچھ عنصر کسی نہ کسی شکل میں موجود ہو اور ان کی گمراہی کی نوعیت زیادہ شدید نہ ہو تو ان کا سدھرنا قدرے آسان ہوتا ہے۔ مگر آپؐ کی اس قوم پر تو آسمانی ہدایت کے بغیر صدیاں بیت گئی ہیں' لہٰذا ان لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے آپؐ کو شدید محنت کرنا پڑے گی۔ گویا آپؐ کا یہ مشن بہت کٹھن ہے: ﴿اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝۵﴾ (المزمل) اس اعتبار سے ہم آپؐ پر یقیناً بہت بھاری ذمہ داری ڈال رہے ہیں۔

آیت ۷ ﴿لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓی اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝۷﴾ ''قول واقع ہو چکا ہے ان میں سے اکثر پر' تو اب وہ ایمان لانے والے نہیں۔''

حَقَّ الْقَوْلُ کا معنی ومراد

لفظ ''حق'' کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا قطعی الوقوع ہونا۔ اس مفہوم میں ہمارے ہاں عام طور پر لفظ ''شدنی'' بولا جاتا ہے۔ یعنی ایسی چیز جس کے واقع ہونے میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ اس لفظ (حق) کے باقی مفاہیم اسی بنیادی معنی سے اخذ ہوئے ہیں۔ مثلاً اسی معنی کی بنا پر اخلاقی اور عقلی طور پر مسلّم الثبوت چیز کو بھی ''حق'' کہا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سا قول ہے جس کے بارے میں یہاں فرمایا گیا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے اکثر پر واقع ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول یا فرمان کا تذکرہ مختلف الفاظ اور مختلف انداز میں تقریباً ان تمام مقامات (سورۃ البقرۃ رکوع ۴' سورۃ الاعراف رکوع ۲' سورۃ الحجر رکوع ۳' سورۂ بنی اسرائیل رکوع ۷' سورۃ الکہف رکوع ۷' سورۂ طٰہٰ رکوع ۷ اور سورۂ صٓ رکوع ۵) پر ہوا ہے جہاں قصہ حضرت آدمؑ و ابلیس بیان ہوا ہے۔ البتہ سورۂ صٓ میں اس قول کا ذکر بہت واضح انداز میں آیا ہے۔ ابلیس جب حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر کے راندۂ درگاہ ہو گیا تو اس نے چیلنج کے انداز میں کہا تھا: ﴿وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ ۝۱۷﴾ (الاعراف) کہ اے اللہ تو نے آدم کو مجھ پر برتری تو دی ہے لیکن اس کی نسل میں سے اکثر لوگ تیرے شکر گزار

بندے بن کر نہیں رہیں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا جو مکالمہ ہوا اس کی تفصیل سورۂ صٓ میں یوں بیان ہوئی ہے: ﴿قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ۝٧٧﴾ ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم نکل جاؤ جنت سے' اب تم مردود ہو چکے ہو۔'' ﴿وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِي إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ ۝٧٨﴾ ''اور اب تم پر میری لعنت رہے گی قیامت کے دن تک''۔ ﴿قَالَ رَبِّ فَأَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝٧٩﴾ ''وہ بولا: اے میرے رب! تو مجھے مہلت دے دے اس دن تک کے لیے جب سب دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔'' ﴿قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ۝٨٠﴾ ''(جواب میں) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ جاؤ ہم نے تمہیں مہلت دے دی۔'' ﴿إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ۝٨١﴾ ''قیامت کے دن تک کے لیے''۔ اس پر ابلیس نے قسم کھا کر گویا خوشی میں جھومتے ہوئے کہا: ﴿فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝٨٢﴾ ''پس تیری عزت کی قسم' میں ان سب کو گمراہ کر کے رہوں گا۔'' ﴿إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ۝٨٣﴾ ''سوائے تیرے خاص بندوں کے جنہیں تو نے اپنے لیے خالص کر لیا ہوگا'' وہ اگر میرے داؤ اور میرے حملوں سے بچ جائیں تو بچ جائیں لیکن ان کی اکثریت کو میں راہِ ہدایت پر نہیں رہنے دوں گا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ أَقُولُ ۝٨٤﴾ ''ارشاد ہوا تو حق یہ ہے اور میں تو حق ہی کہا کرتا ہوں۔'' ﴿لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكَ وَمِمَّن تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ۝٨٥﴾ ''میں بھر کر رہوں گا جہنم کو تجھ سے اور جو بھی تیری پیروی کریں گے ان سب سے۔'' یہ ہے دراصل وہ قول جس کا آیت زیر مطالعہ میں ذکر ہوا ہے۔ تو ان لوگوں پر دراصل اللہ تعالیٰ کا یہ قول صادق آ چکا ہے۔ گویا یہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی گرفت میں آ چکے ہیں۔ اس بات کو عدالتی زبان میں یوں کہا جاتا ہے کہ اس ملزم پر قانون کی فلاں ''دفعہ'' لگ چکی ہے۔ چنانچہ اس سیاق وسباق میں آیت زیر مطالعہ کا مفہوم یہ ہے کہ ان لوگوں کے قلوب واذہان پر غفلت کے بہت دبیز پردے پڑ چکے ہیں' ان کی انانیت اور ہٹ دھرمی اس حد تک بڑھ چکی ہے' اور وہ حقائق کی دنیا سے اس قدر دور جا چکے ہیں کہ اب ان کی اکثریت ایمان لانے والی نہیں ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی دلجوئی

یہاں پر یہ بات اس قدر شدّومدّ کے ساتھ دراصل حضور ﷺ اور اہلِ ایمان کی تسلی اور دلجوئی کے لیے بیان کی گئی ہے' مبادا کہ وہ اپنی محنت کے خاطر خواہ نتائج سامنے نہ آنے پر رنجیدہ

ہوں اور سمجھیں کہ شاید ان کی کوششوں میں کوئی خامی ہے جو یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے۔ دراصل انسانی نفسیات کا معاملہ کچھ یوں ہے کہ ایک ہٹ دھرم انسان تو اپنی ناکامی کا الزام دوسروں کے سر تھوپنے کی فکر میں رہتا ہے' لیکن ایک حساس اور شریف النفس انسان اپنی ناکامی کے اسباب اپنی ذات میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا انسان نفسیاتی طور پر دوسروں کی خطاؤں کا بوجھ بھی اپنے سر لے لیتا ہے کہ میرے فلاں ساتھی کی فلاں ناکامی دراصل میری غلطیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے ہوئی ہے۔ ایسی سوچ ایک حساس انسان کے لیے بلاشبہ سوہانِ روح بن جاتی ہے۔ اسی انسانی نفسیات کے تحت حضور ﷺ مشرکینِ مکّہ کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے بہت پریشان اور غمگین رہتے تھے۔ آپؐ کی اس کیفیت کا ذکر قرآن مجید میں جا بجا ملتا ہے۔ سورۃ الکہف میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مخاطب کر کے دلجوئی کے انداز میں فرمایا: ﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝۶﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ شاید اپنے آپ کو ان کے پیچھے غم کے مارے ہلاک کر لیں گے' اگر وہ اس کلام پر ایمان نہیں لاتے''۔ سورۃ الشعراء میں آپ ﷺ کی اس کیفیت کا ذکر یوں فرمایا گیا: ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝۳﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ شاید اس غم میں اپنی جان کھو دیں گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے''۔ جس زمانے میں سورۂ یونس اور سورۂ ھود نازل ہوئیں اُن دنوں پریشانی اور رنج کی شدت کی وجہ سے حضور ﷺ کے بال سفید ہونا شروع ہو گئے تھے۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ حضورؐ! کیا معاملہ ہے؟ آپؐ کے بالوں میں اچانک سفیدی آنا شروع ہو گئی ہے تو آپؐ نے فرمایا: ((شَيَّبَتْنِيْ هُوْدٌ وَاَخَوَاتُهَا))(۱) کہ مجھے سورۂ ہود اور اس کی بہنوں (اس کی ہم مضمون سورتوں) نے بوڑھا کر دیا ہے۔ حضور ﷺ کو دراصل اس حوالے سے دوطرفہ رنج اور صدمے کا سامنا تھا۔ ایک یہ کہ ایمان نہ لانے والے سب لوگ آپؐ کے عزیز' رشتہ دار' اہل قرابت اور قبیلے کے لوگ تھے۔ ان کے بارے میں آپ ﷺ کو یہ پریشانی لاحق تھی کہ اپنی ہٹ دھرمی کی روش کے نتیجے میں یہ سب لوگ جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔ دوسری طرف آپ کو یہ فکر اور تشویش بھی درپیش تھی کہ ان کے ایمان نہ لانے کے حوالے سے کہیں میری محنت اور کوشش میں کسی کوتاہی کا کوئی عمل دخل

(۱) رواه الترمذی ۔ مشكاة المصابيح، كتاب الرقاق، باب البكاء والخوف۔

نہ ہو۔ اس پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو آیت زیر مطالعہ کے الفاظ ﴿لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ﴾ کے پردے میں حضور ﷺ کی تسلی اور دلجوئی کے حوالے سے یہ مفہوم واضح طور پر جھلکتا دکھائی دیتا ہے کہ اے نبی (ﷺ) نہ تو آپؐ کے طرز تبلیغ میں کوتاہی اور خامی کا کوئی عمل دخل ہے اور نہ ہی آپؐ کی محنت میں کوئی کمی واقع ہو رہی ہے' بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ یہ لوگ شامت اعمال کی زد میں آ چکے ہیں' اور اللہ تعالیٰ کے قانونِ ہدایت وضلالت کی متعلقہ دفعات ان پر لاگو ہو چکی ہیں۔ چنانچہ اب یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔

یہاں ممکن ہے کسی ذہن میں یہ اشکال پیدا ہو کہ فتح مکہ کے وقت تو عرب کے تمام لوگ ہی ایمان لے آئے تھے' ان میں سے شاذ ہی کوئی رہ گیا ہو جو حلقہ بگوش اسلام نہ ہوا ہو' تو اس حوالے سے آیت زیر مطالعہ کے الفاظ ﴿فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۷﴾ کا مفہوم کیا ہوگا؟ چنانچہ اس ضمن میں یہ تاریخی حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ ان آیات کے نزول اور فتح مکہ کے درمیان تقریباً ۱۵ سال کا فصل ہے (کم وبیش سات سال مکی اور آٹھ سال مدنی) اور ان پندرہ سالوں کے دوران میں وہ تمام سردارانِ قریش جو حضور ﷺ کی مخالفت میں پیش پیش تھے وہ سب کے سب حالت کفر میں ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ ان میں سے ستر لوگ تو صرف میدانِ بدر میں مارے گئے تھے۔ چنانچہ ان تمام لوگوں کے بارے میں قرآن مجید کی یہ پیشین گوئی درست ثابت ہوئی اور ان میں سے کسی کو بھی ایمان کی دولت نصیب نہ ہو سکی۔ لہٰذا اس آیت کا مصداق دراصل قریش کے وہ بڑے بڑے سردار اور نمایاں حیثیت کے لوگ ہیں جو حضور ﷺ کی دعوت کا راستہ روکنے کے لیے عملی طور پر سرگرم تھے۔

آیت ۸ ﴿اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۝۸﴾

''ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں اور وہ ان کی ٹھوڑیوں تک اس طرح پہنچے ہوئے ہیں کہ ان کے سر اونچے ہو کر رہ گئے ہیں۔''

مشرکین کے تکبّر کی کیفیت

ذَقْن ٹھوڑی کو کہتے ہیں' اَذْقَان اس کی جمع ہے۔ جبکہ اَعْنَاق جمع ہے عُنُق کی جس کے معنی گردن کے ہیں۔ قَمَحَ یا قَامَحَ کے معنی ہیں اونٹ کا اپنی گردن کو اونچا کرنا۔ اگر اونٹ

کچھ پانی پینے کے بعد اپنی گردن اوپر اٹھالے اور مزید پانی نہ پیے تو اس کی اس کیفیت کو قَمَحَ الْبَعِیْر یا قَامَحَ الْبَعِیْرُ کے الفاظ سے بیان کیا جاتا ہے۔ عرب شتر بانوں کا معمول تھا کہ وہ اونٹ کو ایک جگہ کھڑا رکھنے کے لیے اس کے سر کو پیچھے کی طرف کھینچ کر ہودج وغیرہ کے ساتھ باندھ دیتے تھے۔ ایسے اونٹ کو مُقْمَح کہا جاتا تھا۔ اس آیت میں دراصل مشرکینِ مکّہ کی اسی کیفیت کا ذکر کرنا مقصود ہے' کہ یہ لوگ تعصب' ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اپنے سامنے کے حقائق دیکھنے سے بھی قاصر ہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک آ گئے ہیں اور اس کی وجہ سے اب ان لوگوں کی حالت ان اونٹوں کی سی ہے جن کی گردنوں کو کس کر پیچھے کوہان کی طرف باندھ دیا گیا ہو اور وہ اپنا راستہ بھی دیکھنے کے قابل نہ رہے ہوں۔

گردنوں میں ٹھوڑیوں تک طوق پڑنے اور ان کی وجہ سے سر اوپر اٹھ جانے کی کیفیت دراصل تکبر کا استعارہ ہے' اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کو قبول حق سے روکنے والی رکاوٹوں میں سب سے بڑی رکاوٹ تکبر ہی ہے۔ یہ تکبر ہی تھا جو ابلیسیت اور شیطنیت کی بنیاد بنا۔ ابلیس نے تکبر ہی کی بنیاد پر خود کو بہتر اور برتر سمجھتے ہوئے اَنَا خَیْرٌ مِنْہُ کا نعرہ بلند کیا' جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ ہو گیا۔ علمائے یہود بھی محض تکبر کی بنیاد پر ایمان سے محروم رہے۔ حضور ﷺ کی نبوت و رسالت کے بارے میں انہیں ذرّہ برابر بھی شک نہیں تھا۔ اس بارے میں خود قرآن کی یہ گواہی موجود ہے: ﴿یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ ھُمْ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۴۶' الانعام:۲۰) کہ وہ حضور ﷺ کو بحیثیت نبی ایسے پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ آپؐ پر محض اس لیے ایمان نہ لائے کہ حضور ﷺ کا تعلق بنو اسماعیل سے تھا' اور وہ لوگ خود (بنی اسرائیل) کو بنو اسماعیل سے برتر سمجھتے تھے۔ اسی طرح ابوجہل بھی حضور ﷺ کی نبوت کو خوب پہچانتا تھا' مگر تکبر کی بنا پر وہ بھی آپؐ پر ایمان نہ لا سکا۔ اس ضمن میں اس کا اعترافی بیان تاریخ میں محفوظ ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسے حضور ﷺ کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ بلکہ اس کے ایمان نہ لانے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس کے خاندان کا بنو ہاشم کے ساتھ پشتوں سے مقابلہ چلا آ رہا تھا' اور اپنے حریف خاندان کے ایک فرد کی نبوت کو تسلیم کر کے ہمیشہ کے لیے اس خاندان کا غلام بن جانا اسے گوارا نہیں

تھا۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ولید بن مغیرہ اور عتبہ بن ربیعہ کا بھی تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ یہ دونوں نظریاتی طور پر اسلام کے بالکل قریب آ چکے تھے (عتبہ بن ربیعہ نے تو اسی سوچ کے تحت ذاتی طور پر آخری وقت تک جنگ بدر کو ٹالنے کی کوشش بھی کی تھی) لیکن اپنی گردنوں میں پڑے ہوئے تکبر کے طوقوں کے باعث یہ لوگ ایمان کی دولت سے محروم رہے۔ تکبر کے بارے میں حضور نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

((ثَلَاثٌ مُنْجِيَاتٌ وَثَلَاثٌ مُهْلِكَاتٌ، فَأَمَّا الْمُنْجِيَاتُ :فَتَقْوَى اللّٰهِ فِي السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ، وَالْقَوْلُ بِالْحَقِّ فِي الرِّضٰى وَالسَّخَطِ، وَالْقَصْدُ فِي الْغِنٰى وَالْفَقْرِ، وَأَمَّا الْمُهْلِكَاتُ :فَهَوًى مُتَّبَعٌ، وَشُحٌّ مُطَاعٌ، وَإِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهٖ، وَهِيَ أَشَدُّهُنَّ)) (۱)

''تین چیزیں انسان کو نجات دلانے والی ہیں اور تین چیزیں اس کو ہلاک کرنے والی ہیں۔ وہ جو نجات دلانے والی ہیں: اللہ کا تقویٰ پوشیدہ اور اعلانیہ دونوں حالتوں میں' حق بات کہنا کسی سے راضی یا ناراض ہونے کی حالت میں اور معتدل راہ اختیار کرنا غنی اور فقیر ہونے کی حالت میں۔ اور جو ہلاک کرنے والی ہیں: ہوائے نفس جس کی پیروی کی جائے' دل کا بخل جو انسان کا مطاع بن جائے' اور انسان کا اپنے آپ کو کچھ سمجھنا اور ان میں یہ سب سے زیادہ مہلک ہے۔''

ہلاک کرنے والی چیزوں میں پہلی تو خواہشِ نفس ہے جس کا اتباع کیا جا رہا ہو۔ یعنی نفس جس طرف لیے جا رہا ہے انسان دست بستہ اس کے پیچھے پیچھے اسی طرف چلا جا رہا ہو۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے انسان کا نفس اسے ہلاکت کی طرف ہی لے جائے گا۔ جیسا کہ سورۂ یوسف کی آیت ۵۳ میں حضرت یوسفؑ کے اس قول سے بھی ظاہر ہوتا ہے: ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ ''اور میں اپنے نفس کی براءت نہیں کرتا' بے شک نفس تو ضرور بدی پر اُکساتا ہے'' —— حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق ہلاک کرنے والی دوسری چیز شُحٌّ مُّطَاعٌ ہے' یعنی دل کا بخل اور مال کی محبت۔ مال کی محبت چونکہ نفس انسانی کے تمام داعیات سے زیادہ قوی ہے اس لیے اس کا علیحدہ ذکر کیا گیا —— تیسری اور آخری مہلک

(۱) رواه البيهقي في شعب الايمان ۔ مشكاة المصابيح ، كتاب الآداب، باب الغضب والكبر۔ راوی : ابو هريرة ؓ۔

چیز ہے: اِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِہٖ۔ یعنی انسان کا اپنے آپ کو کچھ سمجھنا' اور یہی دراصل تکبر ہے۔ اس کے بارے میں حضورﷺ نے تاکیداً فرمایا: وَھِیَ اَشَدُّھُنَّ کہ یہ ان تینوں مہلکات میں سب سے زیادہ مہلک ہے۔

آیت ۹ ﴿وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْھِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِھِمْ سَدًّا فَاَغْشَیْنٰھُمْ فَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ ﴾ ''اور ہم نے ان کے سامنے بھی ایک دیوار کھڑی کر دی ہے اور ان کے پیچھے کی جانب بھی ایک دیوار کھڑی کر دی ہے' پس ہم نے ان کو ڈھانپ دیا ہے تو اب وہ دیکھ نہیں سکتے۔''

آگے اور پیچھے دیوار کی توجیہہ

اس تمثیل یا تعبیر کی توجیہہ مختلف مفسّرین نے مختلف انداز میں کی ہے۔ اس بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ اب نہ تو یہ لوگ اپنے پیچھے کے (تاریخی) حقائق سے کوئی سبق حاصل کرنے کے قابل رہے ہیں اور نہ ہی اپنے سامنے کے حالات و واقعات پر غور کرتے ہوئے اپنے لیے عافیت کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔ تاریخی (زمانۂ ماضی کے) واقعات میں انسان کے لیے سبق حاصل کرنے کے بہت سے پہلو ہیں۔ قرآن مجید نے اقوامِ سابقہ کے عبرت انگیز انجام کے واقعات کو انذار و تذکیر کا ذریعہ بتایا ہے: ﴿وَذَکِّرْھُمْ بِاَیّٰىمِ اللّٰہِ ؕ﴾ (ابراھیم: ۵) اور اسی غرض سے یہ واقعات قرآن مجید میں بہت تکرار سے بیان ہوئے ہیں:

﴿اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُھَا فِی الْبِلَادِ ۝ وَثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝ وَفِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ ۝ الَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ ۝ فَاَکْثَرُوْا فِیْھَا الْفَسَادَ ۝ فَصَبَّ عَلَیْھِمْ رَبُّکَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝﴾ (الفجر)

''کیا نہیں دیکھا تم نے کیا برتاؤ کیا تمہارے رب نے قومِ عاد کے ساتھ؟ عادِ ارم' اونچے اونچے ستونوں والی' وہ کہ نہیں پیدا کی گئی اس کی مثل کوئی قوم ملکوں میں۔ اور قوم ثمود کے ساتھ (کیا ہوا)؟ جنہوں نے تراشا سخت چٹانوں کو وادی میں' اور فرعون میخوں والے کے ساتھ (کیا ہوا)؟ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے سرکشی کی تھی ملکوں میں اور بہت پھیلایا تھا ان میں فساد۔ آخر کار برسایا ان پر تیرے ربّ نے عذاب کا کوڑا۔''

اب اگر کوئی انسان ان تاریخی حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر لے اور ان سے کسی قسم کا کوئی سبق حاصل نہ کرے تو اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے اس کے پیچھے کوئی دیوار کھڑی ہو چکی ہو جس کے دوسری طرف وہ دیکھنے سے قاصر ہو۔ اسی طرح ایک عقلمند اور صاحبِ شعور انسان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اعمال و تجربات کا ہر وقت جائزہ لیتا رہے۔ اپنے سامنے کے حالات و حقائق پر گہری نظر رکھے اور پھر ان کے عواقب و نتائج سے سبق سیکھے۔ لیکن اگر کوئی انسان اپنے پیش نظر حقائق سے چشم پوشی کرتے ہوئے ان سے سبق حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا تو گویا اس کی حالت بھی ایسے ہے جیسے کہ اس کے سامنے ایک معنوی دیوار حائل ہو گئی ہو۔ چنانچہ اس اعتبار سے مذکورہ آیت (آیت ۹) کا مفہوم یہ ہوگا کہ یہ لوگ نہ تو ماضی سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی اپنے سامنے کے حالات و حقائق پر نگاہ ڈالنے پر آمادہ ہیں۔ اس طرح عملی طور پر ان کی کیفیت ایسی ہے جیسے ان کے پیچھے بھی دیوار ہے اور ان کے آگے بھی دیوار ہے۔ ﴿فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝۹﴾ تو اس طرح یہ لوگ چاروں طرف سے ڈھانپ دیے گئے ہیں' اب انہیں کچھ بجھائی نہیں دیتا۔

امام رازیؒ چونکہ فلسفی ہیں اس لیے انہوں نے اس تمثیل کی توجیہہ فلسفیانہ انداز میں کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بنیادی طور پر انسان کے لیے ہدایت کے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ تو انسان کی اپنی فکر و نظر ہے۔ یعنی ایک انسان جب اپنے اردگرد انفس و آفاق کی نشانیاں دیکھتا ہے تو ان پر غور و فکر کے نتیجے میں وہ ان کے خالق کو پہچانتا ہے' آخرت کی ضرورت و اہمیت کو سمجھتا ہے اور اپنے لیے سیدھی راہ کا شعور حاصل کرتا ہے۔ اس ہدایت کو ہدایت فکر و نظر کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس ہدایت کا ذکر سورۂ آل عمران میں بایں الفاظ آیا ہے:

﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝۱۹۰ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۱۹۱﴾

''بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور شب و روز کے اختلاف میں عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں' جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے بیٹھے اور اپنے پہلوؤں کے بل اور

غور وفکر کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں' (پھر بے اختیار بول اٹھتے ہیں) کہ اے ہمارے ربّ تو نے یہ سب بے مقصد پیدا نہیں کیا' پاک ہے تو ہر نقص و عیب سے' پس بچالے ہم کو دوزخ کے عذاب سے۔''

امام رازیؒ کے نزدیک ہدایت کی دوسری قسم وہ ہے جو عہد الست (الاعراف:۱۷۲) کے حوالے سے انسان کی فطرت میں مضمر ہے۔ یہ فطری اور جبلی ہدایت اس کے ماضی یعنی نسل ہا نسل سے منتقل ہوتی ہوئی اس تک پہنچتی ہے۔ اب اگر کوئی انسان نہ تو اپنی فکر ونظر سے ہدایت اخذ کرے اور نہ ہی اپنی فطرت کی گہرائیوں میں موجود عہد الست کے شعور کو تازہ کرنے کی کوشش کرے تو گویا اس کے پیچھے اور سامنے دیوار حائل ہو چکی ہے اور اس کیفیت میں اب اسے کسی طرف سے کچھ بجھائی نہیں دیتا۔

اللہ تعالیٰ کا قانونِ ہدایت وضلالت

آیت زیر مطالعہ اور گزشتہ آیت (آیت ۸ اور ۹) کے حوالے سے یہ نکتہ خصوصی طور پر لائق توجہ ہے کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار کی گردنوں میں طوق ڈالنے اور ان کے آگے پیچھے دیواریں کھڑی کرنے کا عمل اپنی طرف منسوب فرمایا ہے کہ ان کے ساتھ ایسا خود ہم نے کیا ہے۔ اس سے بجا طور پر یہ اشکال پیدا ہوسکتا ہے کہ اگر خود اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ ایسا کیا ہے تو پھر ان کی گمراہی میں ان کا کیا قصور ہے؟ اس اشکال کو رفع کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے قانونِ ہدایت کو سمجھنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قانون کی مختلف دفعات جو قرآن مجید کے مختلف مقامات پر بیان ہوئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سی ظاہری اور باطنی صلاحیتیں ودیعت کر کے اس دنیا میں بھیجا ہے۔ ظاہری صلاحیتوں میں انسان کی سماعت' بصارت' عقل وشعور وغیرہ شامل ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً سورۃ الدھر میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا ۢ بَصِيْرًا ۝۲﴾ ''ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے پیدا کیا تاکہ اسے ہم پرکھیں اور آزمائیں' پس ہم نے اسے سمیع اور بصیر بنایا''۔ ظاہر ہے کسی کو جانچنا مقصود ہو تو اسے کچھ دے کر ہی جانچا جاتا ہے اور اگر کسی کا امتحان مطلوب ہو تو پہلے اسے کچھ پڑھایا جاتا ہے' پھر امتحان لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا کی

امتحان گاہ میں سماعت و بصارت اور عقل و فکر کی قوتوں سے مسلح کر کے بھیجا ہے۔ دوسری طرف باطنی صلاحیتوں کے طور پر انسان کو خیر و شر کی تمیز، نیکی و بدی کی پہچان اور فجور و تقویٰ کا علم عطا ہوا ہے۔ جیسا کہ سورۃ الشمس میں فرمایا گیا: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝﴾ کہ اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کو بنایا، سنوارا اور اس میں فجور اور تقویٰ کا علم الہام کر دیا۔ اس علم کی بنیاد پر ہر انسان کی فطرت میں نیکی و بدی کی پہچان اور تمیز موجود ہے۔

(۲) اس ضمن میں دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مذکورہ صلاحیتیں عطا کر کے اسے عمل و ارادے کی کامل آزادی دے دی ہے: ﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝﴾ (الدھر) ''ہم نے اسے سیدھے راستے کی ہدایت (دے کر کھلی آزادی) دے دی ہے۔ اب چاہے وہ شکر گزار بنے، چاہے ناشکرا بن جائے۔''

(۳) اس قانون کی تیسری اہم شق یہ ہے کہ جو انسان اپنے آزادانہ فیصلے کے تحت اپنی ظاہری و باطنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر خیر کے راستے پر چلنا چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ اس راستے کو اس کے لیے آسان کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک نیکی دس نیکیوں کا راستہ کھولتی ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کی مدد سے اس راستے کی مشکلات آسان ہوتی چلی جاتی ہیں۔ دوسرے لوگوں کو دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ خیر کے راستے پر چلنے والے شخص کو بہت کٹھن حالات کا سامنا ہے، لیکن خود اس شخص کو اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے اس راستے میں کوئی مشکل محسوس نہیں ہوتی (اس کے لیے قرآنی اصطلاح ''تیسیر'' ہے)۔ مثلاً جنگ بدر میں دو نوعمر انصاری صحابہ حضرت معوذ اور معاذ رضی اللہ عنہما کے ابوجہل پر حملہ آور ہونے کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ اس معرکے میں حضرت معاذؓ کا بازو کٹ کر لٹک گیا تھا، انہوںؓ نے جب دیکھا کہ لٹکا ہوا بازو لڑائی میں رکاوٹ کا باعث بن رہا ہے تو ہاتھ کے پنجے کو پاؤں کے نیچے دبا کر زور سے کھینچا اور بازو کو علیحدہ کر دیا۔ اندازہ کیجیے! ایک ایسا عمل جس کے ذکر سے سننے والے کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، ایک نوعمر لڑکا اسے کس آسانی سے کر گزرا۔ اسی طرح ایک موقع پر ایک صحابی حضرت خُبیب رضی اللہ عنہ کو کفار نے شہید کرنے کے لیے ایک درخت کے تنے کے ساتھ باندھا تو کسی نے آگے بڑھ کر ان سے سوال کیا کہ اے خبیبؓ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہاری جگہ اس وقت یہاں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوتے اور تم سکون و اطمینان سے اپنے گھر والوں کے ساتھ ہوتے؟ اس پر انہوںؓ نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں! خدا

کی قسم! میں تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ حضور ﷺ کے جسم مبارک کو کوئی کانٹا بھی چبھے۔ پھر جب کسی نے انؓ کے سینے پر نیزے سے وار کیا تو انؓ کی زبان سے بے اختیار فُزْتُ وَرَبِّ الْکَعْبَۃِ کے الفاظ نکلے' کہ ربِ کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا۔ عام حالات میں کسی کا ایسی صورت حال سے عہدہ برآ ہونا کس قدر مشکل اور نا قابل تصور محسوس ہوتا ہے' لیکن وہ لوگ جو نیکی اور بھلائی کے راستے پر گامزن ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی سوچ' ان کے نظریات اور جذبات کو اس انداز میں ڈھال دیتا ہے کہ ان کے لیے ایسے کٹھن مراحل بھی بہت آسان ہو جاتے ہیں۔

اس کے برعکس جو شخص اپنے ارادے اور شعور سے اپنی ظاہری و باطنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے برائی کا راستہ اختیار کرتا ہے' اس کے لیے ایک برائی دس برائیوں کا راستہ کھولتی ہے اور یوں اس کے لیے بھی یہ راستہ آسان کر دیا جاتا ہے۔ ایسے شخص کی سوچ میں ایسی کجی آ جاتی ہے کہ جو برائیاں کبھی اسے بہت بڑی بڑی نظر آتی تھیں وہ رفتہ رفتہ اسے چھوٹی نظر آنے لگتی ہیں اور اس طرح وہ اس غلط راستے پر بہت آسانی سے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

سورۃ الیل کی ابتدائی آیات میں تیسیر للیسریٰ اور تیسیر للعسریٰ کے اصول کے ذکر کے ساتھ ان میں سے ہر راستے کے لیے تین استعدادات کا ذکر بھی آیا ہے۔ نیکی' بھلائی اور جنت کے راستے اور اس کے لیے مطلوبہ صلاحیتوں کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے: ﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ۝۵ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ۝۶ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی ۝۷﴾ یعنی جو کوئی (i) انفاق فی سبیل اللہ اور جود و سخا کی روش اپنائے۔ (ii) تقویٰ اختیار کرے اور نیکی و بدی میں تمیز کرنے کی صلاحیت بروئے کار لائے۔ اور (iii) جب' جہاں کہیں کوئی اچھی بات اس کے سامنے آئے وہ کسی مصلحت اور عصبیت وغیرہ کی پروا کیے بغیر فوراً اس کی تصدیق کرے ——— تو نیکی اور بھلائی کے راستے کی ہر مشکل اس کے لیے آسان ہوتی چلی جائے گی اور بالآخر وہ الْیُسْرٰی (سب سے بڑی آسانی کے مقام یعنی جنت) تک پہنچ جائے گا۔ اس کے برعکس برائی کے راستے کی آسانی اور اس کے لیے مطلوبہ شرائط کا ذکر سورۃ الیل کی اگلی آیات میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی ۝۸ وَکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ۝۹ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی ۝۱۰﴾ کہ (i) جس نے انفاق فی سبیل اللہ کے مقابلے میں بخل کی روش اختیار کی۔ (ii) تقویٰ کے برعکس استغناء برتا۔ یعنی نیکی و بدی کے عواقب و نتائج سے بے پروا ہو کر اس

پالیسی پر عمل پیرا رہا کہ: ع ''اب تو آرام سے گزرتی ہے' عاقبت کی خبر خدا جانے'' اور (iii) تصدیق بالحسنٰی کے برعکس اس نے حق اور اچھی باتوں کی تکذیب کا طرزِ عمل اپنائے رکھا' تو ایسے شخص کے لیے برائی کا راستہ رفتہ رفتہ آسان سے آسان تر ہوتا چلا جائے گا اور اس راستے پر چلتے چلتے بالآخر وہ اَلْعُسْرٰی (سب سے بڑی مشکل یعنی جہنم) تک پہنچ جائے گا۔

(۴) اس قانونِ خداوندی کی آخری شق یہ ہے کہ غلط راستے پر چلتے ہوئے جب کوئی شخص point of no return پر پہنچ جاتا ہے' یعنی وہ برائی میں اس حد تک آگے بڑھ جاتا ہے کہ اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں رہتا تو اس کی باطنی مثبت صلاحیتیں غیر مؤثر ہو کر رہ جاتی ہیں۔ یہ متعلقہ شخص کے اعمال اور رویے کا بالکل منطقی اور سائنٹیفک نتیجہ ہے۔ فزیالوجی (علم الاعضاء) کی اصطلاح میں اسے disuse artophy کہتے ہیں۔ یعنی اگر آپ نے اپنے کسی عضو کا استعمال مستقل طور پر بند کر دیا تو اس عضو کی استعداد اور صلاحیت رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی۔ مثلاً اگر انسان کی آنکھ پر چھ ماہ تک مسلسل پٹی بندھی رہے گی تو اس آنکھ کی بصارت زائل ہو جائے گی۔ بالکل ایسا ہی معاملہ انسان کی نفسیاتی اور باطنی صلاحیتوں کا بھی ہے۔ ظاہر ہے انسان کو نیکی و بدی کی تمیز کی استعداد تو اس لیے ودیعت کی گئی ہے (بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو انسان کی فطرت میں خیر اور نیکی کا خصوصی رجحان بھی ودیعت کیا ہے) تاکہ انسان اپنی عملی زندگی میں اس سے کام لے' لیکن اگر کوئی انسان اپنی اس استعداد اور صلاحیت کو کبھی استعمال ہی نہ کرے اور مسلسل برائی کے راستے پر ہی چلتا رہے تو ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ اس کی یہ صلاحیت ختم ہو جائے گی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان مستقل طور پر برائی کے شکنجے میں جکڑا جاتا ہے اور جہاں سے نیکی کے راستے کی طرف اس کی واپسی ممکن نہیں رہتی۔ اس کے بعد ایسے انسان پر خیر و فلاح کے تمام دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کا ذکر بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً:

(i) ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ (البقرۃ:۷)

''اللہ نے ان کے دلوں اور ان کی سماعت پر مہر لگا دی ہے اور ان کی بصارت پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔''

(ii) ﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝۱۸﴾ (البقرۃ:۱۸)

''یہ اندھے، بہرے اور گونگے ہو چکے ہیں، پس اب یہ لوٹنے والے نہیں۔''

(iii) ﴿فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ﴾ (المنافقون:۳)

''پس ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے۔''

اس قانونِ ہدایت وضلالت کے حوالے سے بنیادی نکتہ سمجھنے کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے دلوں پر مہر دراصل ان کے منفی رویے کی سزا کے طور پر لگاتا ہے۔ جیسے کہ سورۃ المطففین میں فرمایا گیا: ﴿كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾﴾ کہ جو اعمالِ بد ان لوگوں نے کمائے ہیں، ان اعمال کا زنگ ان کے دلوں پر لگ گیا ہے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے دلوں پر جو مہر لگتی ہے وہ دراصل ان کے اپنے اعمال ہی کی سیاہی سے عبارت ہوتی ہے۔ یہ نکتہ سورۃ الصف کی آیت ۵ میں اس طرح واضح فرمایا گیا ہے: ﴿فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ۭ﴾ کہ جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو بھی ٹیڑھا کر دیا۔ یعنی ''ٹیڑھے ہونے'' کا فیصلہ ان کا اپنا تھا۔ البتہ ان کے اس باغیانہ فیصلے یا عمل کی سزا انہیں یوں ملی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل ہمیشہ کے لیے ٹیڑھے کر دیے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کے بعد متعلقہ انسان کے زاویہ نگاہ میں مستقل طور پر کجی آ جاتی ہے، اس کی سوچ کا انداز ٹیڑھا ہو جاتا ہے، اور پھر نیکی اور بھلائی کی کوئی بات A square peg in a round hole کی طرح اس کے ذہن میں اپنی جگہ بنا ہی نہیں سکتی۔

ظاہر ہے انسانی فطرت اندھی بہری نہیں ہے۔ وہ حق کو فوری طور پر پہچان لیتی ہے اور اس کی بے لاگ گواہی بھی دیتی ہے، مگر بسا اوقات انسان ضد، انا، تعصب یا کسی اور وجہ سے اس کا اعتراف نہیں کرتا اور جانتے بوجھتے اپنی فطرت کی گواہی کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ جیسے دو آدمیوں کی بحث کے دوران میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کا دل تسلیم کر لیتا ہے کہ میرے مدمقابل کا موقف درست ہے، لیکن وہ محض اپنی انا کی وجہ سے اس کا اعتراف نہیں کرتا اور خواہ مخواہ بحث کو طول دیے جاتا ہے۔ ایسی بحث کے موقع پر جس قدر زیادہ لوگ موجود ہوں گے، جھوٹے آدمی کے لیے اپنی غلطی کو تسلیم کرنا اسی قدر مشکل ہوگا۔ انسان کے اس طرزِ عمل کا ذکر سورۃ البقرۃ، آیت ۲۰۶ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ﴾ ''جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کا خوف کرو تو غرور اس کو گناہ میں پھنسا دیتا ہے۔''

یہ مضمون بنیادی طور پر سورۃ الانعام کی اس آیت میں بیان ہوا ہے: ﴿وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾ ''ہم ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو الٹ دیں گے جیسے کہ وہ اس (قرآن) پر پہلی بار ایمان نہیں لائے تھے' اور ہم چھوڑ دیں گے ان کو کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں''۔ گویا اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ جب کسی انسان کا دل حق کو پہچان لے تو وہ فوراً اس کا اعتراف کرے۔ لیکن اگر وہ انکشافِ حق کے بعد بھی اس سے اعراض کرے گا اور حق کے مقابلے میں اپنی عزت' انا یا کسی اور مصلحت کو مقدم رکھے گا تو وہ حق کی توہین کا مرتکب ہوگا اور اس جرم کی سزا اسے ضرور مل کر رہے گی۔ اس سزا کا ایک انداز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی دیکھنے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں (اَفْـِٕدَتَهُمْ) کو تلپٹ کر دیتا ہے۔ تو یہ سارا معاملہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے طے شدہ قانون (قانونِ ہدایت و ضلالت) کے تحت ہوتا ہے' اسی لیے اللہ تعالیٰ اس کے مختلف مراحل کو اپنی طرف منسوب فرماتا ہے اور اسی لیے یہاں اللہ تعالیٰ نے مشرکینِ مکّہ کی گردنوں میں طوق ڈالنے اور ان کے آگے پیچھے دیواریں کھڑی کرنے کے عمل کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔

آیت ۱۰ ﴿وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ان کے حق میں برابر ہے' خواہ آپ انہیں انذار فرمائیں' خواہ نہ فرمائیں' یہ ایمان نہیں لائیں گے۔''

اِنْـذَار کا درست ترجمہ ''ڈرانا'' نہیں بلکہ ''خبردار کرنا'' ہے۔ یعنی کسی ایسی حقیقت کے ممکنہ منفی نتائج سے انسان کو آگاہ کر دینا جس سے وہ بے خبر ہو۔ جبکہ ڈرانے کا تعلق کسی خوفناک چیز کے تصور سے ہے۔

اس آیت کے حوالے سے یہ نکتہ خصوصی طور پر لائق توجہ ہے کہ یہاں سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ (ان کے لیے برابر ہے) فرمایا گیا ہے سَوَآءٌ لَّكَ (آپ کے لیے برابر ہے) نہیں فرمایا گیا۔ مطلب یہ کہ آپؐ کو تو انذار کرنا ہی ہے' اس سے آپؐ کو اجر و ثواب ملے گا' آپؐ کے درجات بلند ہوں گے۔ ہاں' البتہ آپؐ کا انذار کرنا یا نہ کرنا ان کے حق میں برابر ہے۔ اس لیے کہ ان لوگوں کو آپؐ کے انذار سے کوئی فائدہ پہنچنے والا نہیں۔ لہٰذا اگر آپؐ کی اس محنت اور مشقت کے نتائج ان لوگوں کے حوالے سے آپؐ کی توقع کے خلاف نکلتے ہیں تو آپؐ دل گرفتہ اور غمگین نہ ہوں۔ یہ

لوگ دراصل ہمارے قانونِ ہدایت و ضلالت کی آخری ''دفعہ'' (دلوں پر مہر لگ جانے کی کیفیت) کی گرفت میں آ چکے ہیں۔ اس لیے اب ان کے سیدھی راہ پر آنے کا کوئی امکان نہیں۔

سورۃ البقرۃ کی آیات سے مشابہت

زیرِ مطالعہ آیت اور سورۃ البقرہ کی درج ذیل آیت کے درمیان بہت گہری مناسبت اور مشابہت پائی جاتی ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝۶ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝۷﴾

''یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا (یعنی وہ لوگ کہ جو کفر پر اڑ گئے) ان کے لیے برابر ہے (اے محمد ﷺ) کہ آپ انہیں انذار فرمائیں یا نہ فرمائیں' وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اللہ نے مہر کر دی ہے اُن کے دلوں پر اور اُن کے کانوں پر' اور ان کی آنکھوں کے سامنے پردہ پڑ چکا ہے' اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔''

ایسے لوگوں کے لیے سورۃ البقرہ کے دوسرے رکوع میں یہ تمثیل بھی بیان ہوئی ہے:

﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّاۤ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِیْ ظُلُمٰتٍ لَّا یُبْصِرُوْنَ ۝۱۷ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ۝۱۸﴾

''ان کی مثال ایسے ہے جیسے ایک شخص نے آگ جلائی۔ جب آگ نے اس کے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ تعالیٰ ان کے نور کو لے گیا اور انہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ اب کچھ نہیں دیکھتے۔ وہ اندھے ہیں' بہرے ہیں' گونگے ہیں' اب وہ لوٹنے والے نہیں۔''

یہ ایک ایسے قافلے کی مثال ہے جو اندھیری رات میں بھٹک رہا تھا۔ اللہ کے کسی بندے نے اِدھر اُدھر سے لکڑیاں اکٹھی کر کے آگ جلا دی تو ماحول روشن ہو گیا۔ مگر وہ قافلے والے لوگ ایسے بدقسمت تھے کہ جونہی ماحول روشن ہوا ان کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔ چنانچہ وہ لوگ خارج کی روشنی سے بھی کوئی استفادہ نہ کر سکے اور اندھیرے ہی میں ٹھوکریں کھاتے رہ گئے۔

آیت ۱۱ ﴿اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ

﴿وَّاَجۡرٍ كَرِیۡمٍ﴿۱۱﴾﴾ ''آپ تو خبردار کر سکتے ہیں صرف اُسی کو جو یاددہانی کی پیروی کرے اور جو ڈرتا ہو رحمٰن سے غیب میں رہتے ہوئے۔ پس آپ بشارت دے دیجیے اس کو مغفرت کی اور ایک بڑے باعزت اجر و ثواب کی۔''

یہاں فعل (تُنذِر) نتیجۂ فعل کا فائدہ دے رہا ہے۔ یعنی اے نبی ﷺ! آپؐ کا اِنذار صرف انہی لوگوں کے لیے نتیجہ خیز ثابت ہوگا جو ''الذکر'' کا اتباع کرتے ہوں اور رحمٰن سے ڈرتے ہوں، ورنہ ظاہر ہے حضور ﷺ انذار تو ابوجہل اور ابولہب کو بھی فرماتے رہے اور آخری وقت تک فرماتے رہے۔

قرآنِ مجید سے اخذِ ہدایت کی شرائط

جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے، یہ مضمون سورۃ البقرۃ کے آغاز میں بھی آیا ہے، لیکن وہاں اس کی ترتیب اور ہے۔ وہاں ہدایت کے لیے شرائط کا ذکر پہلے ہے اور کفار کے بارے میں سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ...... کا بیان بعد میں آیا ہے۔ جبکہ یہاں سورۂ یٰسٓ میں سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ...... کا حکم پہلے (آیت ۱۰ میں) آیا ہے اور انذار کے مفید ہونے کی شرائط بعد میں آیت زیرِ مطالعہ کے اندر بیان کی گئی ہیں۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲ میں قرآن مجید کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ یہ ﴿هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ﴾ ''متقین کے لیے ہدایت ہے''۔ یعنی قرآن مجید سے ہدایت اخذ کرنے کے لیے انسان کے پاس تقویٰ کی تھوڑی بہت پونجی کا ابتدا میں بھی پایا جانا ناگزیر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسا انسان جس کا نفس خیر اور شر کی تمیز کھو چکا ہو وہ قرآن مجید سے ہدایت اخذ نہیں کر سکتا۔ اس حوالے سے یہ نکتہ واضح رہنا چاہیے کہ قرآن مجید کے اندر ہدایت کا موجود ہونا اور اس سے ہدایت اخذ کرنا دو الگ الگ باتیں ہیں۔ بلاشبہ قرآن کے اندر پوری نوعِ انسانی کے لیے ہدایت ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ (البقرۃ:۱۸۵) موجود ہے۔ لیکن اس سے ہدایت اخذ صرف وہی لوگ کر سکیں گے جن کے پاس تقویٰ کی کچھ نہ کچھ پونجی موجود ہوگی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے چینی کے اندر مٹھاس تو موجود ہے لیکن اس کی مٹھاس کو محسوس وہی شخص کر سکے گا جس میں یہ اہلیت موجود ہوگی۔ ظاہر ہے اگر کسی شخص کے taste buds ہی کام کرنا چھوڑ چکے ہوں تو اسے مٹھاس، کھٹاس، کڑواہٹ وغیرہ کا کچھ بھی احساس نہیں ہو سکتا۔

سورۃ البقرہ کی مذکورہ آیات میں قرآن مجید سے ہدایت اخذ کرنے کے لیے جو دوسری شرط بیان ہوئی ہے وہ ایمان بالغیب سے متعلق ہے: ﴿اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ﴾ یعنی قرآن مجید سے ہدایت کے طالب انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ متقی ہونے کے ساتھ ساتھ غیب کو ماننے کے لیے بھی تیار ہو۔ عقلی طور پر وہ اس حقیقت کو سمجھنے کی حد تک ضرور بالغ نظر (mature) ہو کہ اس کائنات کے اصل حقائق ہمارے حواس کی سرحد سے بہت پرے ہیں اور یہ کہ جو حقائق ہمارے حواس کی گرفت میں آتے ہیں وہ اصل حقائق کا ایک بہت چھوٹا سا جزو ہیں۔ اس حوالے سے چینی فلاسفر کنفیوشس (۵۵۱ تا ۴۷۹ ق م) نے بڑے پتے کی بات کی ہے۔ وہ کہتا ہے:

There is nothing more real than what can not be seen; and there is nothing more certain than what can not be heard

''جو چیزیں ان آنکھوں سے دیکھی نہیں جا سکتیں ان سے زیادہ حقیقی چیز اور کوئی نہیں۔ اور جو حقائق ان کانوں سے سنے نہیں جا سکتے ان سے زیادہ یقینی حقیقت اور کوئی نہیں۔''

چنانچہ بہت بڑا دانا ہے وہ انسان جو اس حقیقت کو سمجھتا ہے کہ ''کُل حقیقت'' یہ نہیں جو ہمارے حواس کی گرفت میں آتی ہے بلکہ ''حقیقت'' کا اصل اور بڑا حصہ وہ ہے جو پردۂ غیب میں ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ انسان جو صرف ظاہری حقائق کو ہی اصل اور کل حقیقت سمجھتا ہے' اس کی مثال بحری جہاز کے اس کپتان کی سی ہے جو کسی آئس برگ کی نوک (tip) کو دیکھ کر یہ سمجھے کہ میرے سامنے برف کا تودہ بس اتنا سا ہی ہے جتنا مجھے نظر آ رہا ہے اور یہ کہ اس کے نیچے پانی کے اندر پوشیدہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کسی آئس برگ کا بہت تھوڑا سا حصہ پانی کی سطح سے اوپر نظر آتا ہے جبکہ اس کا اصل اور کئی گنا بڑا حصہ تو پانی کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس لیے جو کپتان صرف سطح آب کے اوپر نظر آنے والے برف کے تودے کو ہی اصل آئس برگ سمجھ کر اپنے جہاز کا رخ متعین کرے گا وہ دراصل اپنے جہاز کو تباہی کے راستے پر لے جائے گا۔ گویا ''ایمان بالغیب'' حصولِ ہدایت کی بنیادی شرط اور حکمت کا نقطۂ آغاز ہے۔ تو سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات میں قرآن مجید سے ہدایت اخذ کرنے کے لیے دو شرائط بتائی گئی ہیں (اسی طرح سورۃ النور کے پانچویں رکوع میں نورِ ایمان کے دو اجزائے ترکیبی کا ذکر ہے کہ نورِ فطرت اور نورِ وحی کے امتزاج سے نورِ ایمان وجود میں آتا ہے)۔ ان دو شرائط میں پہلی شرط تقویٰ ہے۔ یعنی

انسان کی نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کی حس زندہ و فعال ہو (اس کا نفس لوامہ مؤثر اور بیدار ہو اور اسے برائی پر ملامت کرتا ہو)۔ اگر یہ حس بیدار نہ ہو تو انسان ہدایت و معرفت کے بڑے سے بڑے خزانے سے بھی استفادہ نہیں کر سکے گا اور برائی کے رستے پر چلتے ہوئے اس کے واپس آنے کا امکان ختم ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے حواس کی سرحدوں سے ماوراء حقائق کی حقیقت کو تسلیم کرتا ہو۔ یعنی وہ غیب پر ایمان رکھتا ہو۔ اسی طرح یہاں آیت زیر مطالعہ میں انذار کے مفید اور نتیجہ خیز ہونے کے لیے بھی دو شرائط کا ذکر ہے' یعنی اتباعِ ذکر (یاد دہانی کی پیروی) اور اللہ تعالیٰ کی خشیت' غیب میں ہونے کے باوجود۔

'ذکر' کا جامع مفہوم

ذکر کے لغوی معنی یاد دہانی کے ہیں اور اسے پرکھنے کے لیے اصل کسوٹی انسان کا باطن ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیکی و بدی کی تمیز اور ہدایت سے متعلق اہم حقائق کا شعور انسان کے باطن (اس کی فطرت یا اس کے نفس) میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ اس لیے انسان کو ہدایت کے لیے اہم حقائق کی تعلیم کی نہیں' تذکیر یعنی یاد دہانی کی ضرورت ہے۔ (قرآن مجید میں لفظ ''تذکیر'' اس حوالے سے بہت کثرت کے ساتھ استعمال ہوا ہے) تعلیم کا تعلق انسان کو ایسی چیزیں سکھانے سے ہے جو اسے پہلے سے معلوم نہ ہوں' جبکہ تذکیر ان حقائق کی یاد تازہ کرنے کا عمل ہے جن سے انسان کی فطرت پہلے سے واقف ہے۔ البتہ دنیا میں رہتے ہوئے چونکہ ذہول اور نسیان کے پردوں کے باعث ان حقائق کا شعور اکثر انسان کی یادداشت کے ذخیرے کے اندر تحت الشعور کی گہرائیوں میں چلا جاتا ہے' اس لیے ایسے حقائق کو دوبارہ انسان کے شعور کی سطح پر لانے کے لیے یاد دہانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بالکل ایسے جیسے کسی دفتر سے کوئی پرانی فائل نکالنے کے لیے متعلقہ حوالوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ تو قرآن مجید دراصل انسانی فطرت یا روح کے اندر پہلے سے موجود حقائق کے شعور کو اجاگر کرنے کے لیے تذکیر (یاد دہانی) کرتا ہے۔

اس تذکیر یا یاد دہانی کی مثال ایسے ہے جیسے آپ اپنے کسی بہت پرانے دوست کو بظاہر بھولے ہوتے ہیں' لیکن جب آپ اس کی طرف سے بطور تحفہ دی گئی کسی چیز کو اچانک دیکھتے ہیں تو اس کی یاد آپ کے حافظے میں فوراً تازہ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح انسان کی فطرت کے اندر اللہ تعالیٰ کی ذات کا عرفان موجود ہے۔ انسان کی روح اپنی پیدائش کے وقت اللہ سے وہ عہد

کر چکی ہے جس کا ذکر سورۃ الاعراف کی آیت ۱۷۲ میں آیا ہے۔ البتہ دنیا میں آنے کے بعد انسانی روح پر عموماً مادیت اور غفلت کے پردے پڑ جاتے ہیں' قرآن مجید کے پیغام کے ابلاغ سے یہ پردے اٹھ جاتے ہیں' انسانی روح کو اس کا بھولا ہوا عہد یاد آ جاتا ہے اور اہم حقائق سے متعلق وہ یادیں جو اس کے تحت الشعور کی گہرائی میں چلی گئی تھیں' وہ دوبارہ اس کے شعور کی سطح پر آ جاتی ہیں۔ یہ ہے تذکیر اور یہ ہے قرآن کا سب سے اہم فنکشن۔ چنانچہ سورۂ ق میں حضور ﷺ کو خصوصی طور پر قرآن کے ذریعے ''تذکیر'' کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ ﴿٤٥﴾﴾ ''پس آپ تذکیر کرتے رہیے اِس قرآن کے ذریعے سے ہر اُس شخص کو جو میری وعید سے ڈرتا ہے۔''

ظاہر ہے اگر انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کا کچھ خوف ہو گا تو تبھی وہ قرآن کی تذکیر کو قبول کرے گا اور تبھی وہ قرآن کے احکام پر عمل کر کے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے کی کوشش کرے گا۔ گویا قرآن کی تذکیر صرف اسی انسان کے لیے فائدہ مند ہو سکتی ہے جس کی فطرت میں نیکی و بدی کی تمیز زندہ ہو۔ ایسے انسان کی پہچان یہ ہے کہ اگر اسے نیکی کی توفیق ملتی ہے تو اسے خوشی ہوتی ہے اور اگر اس سے کوئی غلط کام سرزد ہو جاتا ہے تو اسے فوراً پریشانی لاحق ہو جاتی ہے۔ کسی انسان کا نیکی پر خوش ہونا اور برائی پر رنجیدہ و پریشان ہونا ظاہر کرتا ہے کہ نیکی کے نیکی ہونے اور برائی کے برائی ہونے کی یاد اس کے شعور میں تازہ ہے اور یہ کہ اس کی روح میں زندگی کی رمق ابھی باقی ہے۔ اس لیے قرآن کی تذکیر ایسے انسان کے لیے ضرور مفید ہو گی۔ ظاہر ہے انسان کے جسم میں اگر زندگی کی حرارت موجود ہو گی تو تبھی کسی معالج کا علاج اسے کچھ فائدہ پہنچا سکے گا۔ چنانچہ اگر کسی انسان کے اندر نیکی و بدی میں تمیز کرنے کی حس زندہ و فعال ہے تو اس کا دل حق اور سچی بات کی فوراً گواہی دے گا۔ اس لیے ''اتباعِ ذکر'' کا عملی تقاضا یہ ہے کہ جب انسان کے سامنے حق آئے اور اس کا دل گواہی بھی دے دے کہ ہاں یہ حق ہے' تو انسان اس حق کو بلا حیل و حجت فوراً تسلیم کر لے اور اس فیصلے میں کسی حمیت' عصبیت یا اپنی عزتِ نفس کے جذبے کو آڑے نہ آنے دے۔

یہاں یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ لفظ ''الذِّکر'' کا مصداقِ اکمل اور مصداقِ اَتم خود قرآن مجید ہے۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر یہ لفظ اپنے لیے بطور اسمِ عَلَم استعمال کیا ہے۔ سورۃ الحجر کی

اس آیت میں کفار کا قول نقل کرتے ہوئے قرآن مجید کے لیے لفظ ''الذِّکر'' استعمال ہوا ہے: ﴿وَقَالُوْا یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝۶﴾ ''اور انہوں نے کہا کہ اے وہ شخص جس پر (اُس کے بقول) یہ ذکر نازل ہوا ہے (ہمارے نزدیک) تم تو یقیناً دیوانے ہو''۔ اسی سورہ کی اس آیت میں خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کو ''الذِّکر'' قرار دیا ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹﴾ ''اور ہم نے ہی اس الذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں''۔ پھر سورۃ النحل میں فرمایا گیا: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ ۝۴۴﴾ ''اور آپ کی طرف یہ الذکر ہم نے اس لیے نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو واضح طور پر بتا دیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے شاید کہ وہ غور و فکر کریں۔''

چنانچہ خود قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت زیر مطالعہ کے الفاظ ''مَنِ اتَّبَعَ الذِّکْرَ'' میں ''الذِّکر'' کا مصداقِ اوّلین خود قرآن حکیم ہے۔ مطلب یہ کہ قرآن انسانوں کی فطرت کے اندر مضمر حقائق اور شہادتوں کو اُجاگر کرتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ ان حقائق اور شہادتوں کا ذکر ہے جن کا تعلق ایمان سے ہے جو ہر انسان کی فطرت کے اندر بالقوۃ موجود ہے۔ اس کے ساتھ صراطِ مستقیم سے متعلق اُن قرآنی احکام کے معاملے کو گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے جن کا تعلق انسان کے اعمال سے ہے۔

ایمان بالغیب رکھنے والوں کے لیے خوشخبری

''تذکیر'' کے مفید ہونے کی دوسری شرط آیت زیر مطالعہ میں یہ بتائی گئی ہے کہ غیب میں ہونے کے باوجود انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی خشیت ہو۔ اس شرط میں ایمان بالغیب رکھنے والوں کے لیے ایک طرح سے حوصلہ افزائی اور تحسین کا انداز بھی پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی اصل اہمیت تو یہی ہے کہ اس کے غیب میں ہوتے ہوئے اس سے ڈرا جائے۔ قیامت کے دن جب غیب کے پردے اٹھ جائیں گے، اس دن کا ڈرنا کسی کے لیے کچھ فائدہ مند نہیں ہوگا۔ اس دن کا ایک منظر سورۃ الفجر میں یوں بیان کیا گیا ہے: ﴿وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝۲۲ وَجِایْٓءَ یَوْمَىٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ یَوْمَىٕذٍ یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ۝۲۳﴾ ''اور آپ کا ربّ آئے گا اس حال میں کہ فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے۔ اور جہنم اس دن سامنے لائی جائے گی۔ اُس دن انسان نصیحت تو قبول کرے گا مگر اس وقت

اسے نصیحت سے کیا حاصل ہوگا!''

اللہ تعالیٰ کے نزولِ اجلال کی کیفیت ہمارے فہم و تصور سے ماوراء ہے۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نہ تو کسی مقام پر محدود ہے اور نہ ہی اس کی کوئی جہت ہے۔ اس لیے ہم تصور نہیں کر سکتے کہ یہ نزول کس شان سے ہوگا۔ بہر حال اس روز جب اللہ تعالیٰ نزولِ اجلال فرمائیں گے تو اس کے سامنے فرعون اور ابوجہل جیسے بڑے بڑے سرکش لوگوں پر لرزہ طاری ہوگا اور اس وقت انہیں سب کچھ یاد آ جائے گا' لیکن اُس وقت کی یاددہانی کسی کو کچھ فائدہ نہیں دے گی۔

بِالْغَیْبِ کی وضاحت

یہاں پر لفظ غیب کے بارے میں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ اس لفظ کا تعلق ہم انسانوں سے ہے' اللہ تعالیٰ کے لیے تو کچھ بھی غیب میں نہیں۔ یعنی غیب میں دراصل ہم انسان ہیں' اللہ تعالیٰ غیب میں نہیں ہے۔ جیسا کہ شیخ علی ہجویریؒ کی کتاب ''کشف المحجوب'' کا عنوان ظاہر کر رہا ہے۔ کشف المحجوب کے معنی اس شخص کا حجاب (پردہ) ہٹانے کے ہیں جو حجاب میں آیا ہوا (محجوب) ہو۔ تو محجوب ہم انسان ہیں' اللہ تعالیٰ محجوب نہیں ہے۔ اس ضمن میں امام رازیؒ کی وضاحت کا انداز بہت پیارا اور بصیرت افروز ہے۔ آپ فرماتے ہیں: فَسُبْحٰنَ الَّذِی احْتَجَبَ بِشِدَّۃِ ظُھُوْرِہٖ کہ پاک ہے وہ ذات جس کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے شدتِ ظہور کے باعث ہماری نگاہوں سے چھپ گیا ہے۔ ظاہر ہے ہم انسان اللہ تعالیٰ کے نظارے کی تاب نہیں رکھتے۔ جیسے سورج کے عیاں ہونے کی شدت اتنی زیادہ ہے کہ ہماری نگاہیں اس کے نظارے کی تاب نہیں لاسکتیں۔ اس مفہوم کے حوالے سے مجھے اپنے دسویں کلاس کے زمانے کی عربی کتاب سے ایک نظم کا یہ مطلع ابھی تک یاد ہے:

اَغِیْبُ وَ ذُوالـلَّـطَـائِفِ لَا یَـغِـیْـبُ
وَاَرْجُـوْہُ رَجَـاءً لَا یَـخِـیْـبُ

کہ میں اوٹ میں آ جاتا ہوں' میں محجوب ہو جاتا ہوں اور اللہ جو ''ذوالطائف'' ہے وہ کبھی غائب نہیں ہوتا۔ اور میں اُس سے ایسی اُمید وابستہ کیے ہوئے ہوں جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں — اللہ تو ہر آن' ہر جگہ موجود ہے: ﴿وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ ؕ﴾ (الحدید: ٤) ''وہ تو تمہارے ساتھ ہوتا ہے تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو''۔ سورۂ قٓ میں یہی مضمون یوں بیان ہوا

ہے:﴿نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ﴿۱۶﴾﴾ ''اور ہم تو انسان سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں''۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نہ غیب میں ہے' نہ کہیں سے دور ہے اور نہ مخفی ہے۔ وہ اپنے ظہور کی شدت کے باعث ہم سے مخفی ہو گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے دو اسم عَلَم

آیت زیر مطالعہ میں اللہ تعالیٰ کا اسم ''الرحمٰن'' بطور اسمِ عَلَم آیا ہے۔ اس بارے میں یہ نکتہ خصوصی طور پر لائق توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے دو اسماء کو اسمِ عَلَم کا درجہ دیا ہے' یعنی اللہ اور الرحمٰن۔ ان دونوں اسماء کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کی اس آیت میں ایک ساتھ آیا ہے:

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۚ﴾ (آیت ۱۱۰)

''کہو کہ چاہے اللہ کہہ کر پکارلو' چاہے رحمٰن کہہ کر پکارلو۔ جس نام سے بھی تم پکارو یہ جان لو کہ تمام اچھے نام اُسی کے ہیں۔''

اسم ذات ''اللہ'' (معبود و مالک) میں ہیبت اور جلال کا رنگ جھلکتا ہے۔ جبکہ ''رحمٰن'' اللہ تعالیٰ کا جمالی نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ نام فَعْلَان کے وزن پر ہے۔ عربی زبان میں اس وزن پر جو بھی صفت آتی ہے اس کے مفہوم میں بہت شدت پائی جاتی ہے۔ مثلاً اسی وزن پر لفظ غَضْبان کے معنی انتہائی غضب ناک کے ہیں۔ جَوْعَان اس شخص کو کہا جاتا ہے جو بھوک سے مرا جا رہا ہو۔ عَطْشَان اسے کہا جائے گا جس کی پیاس سے جان نکلی جا رہی ہو۔ تو رحمٰن وہ ہستی ہے جس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی مانند ہو۔ اس ضمن میں یہاں ایک بہت لطیف نکتہ سمجھنے کا یہ ہے کہ آیت زیر مطالعہ میں اللہ عزوجل کا نام الرحمٰن ''خشیت'' کے ساتھ آیا ہے: ﴿وَخَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ﴾۔ مبادا کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رحمت پر تکیہ کرتے ہوئے بے عملی اور گناہ کی طرف مائل ہو جائے۔ بالکل اسی طرح سورۃ الاحزاب کی آیت ۲۱ میں رَجَاء (اُمید) کا ذکر اسم ذات ''اللہ'' کے ساتھ آیا ہے: ﴿مَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ .....﴾ تاکہ انسان اللہ تعالیٰ کے جلال کے تصور کے سبب کہیں ہمت ہار کر ہی نہ بیٹھ جائے۔

رحمٰن کی رحمانیت کے حوالے سے انسان اگر شیطان کے دھوکے میں آ جائے تو وہ بے باک اور جری ہو جائے گا۔ اور اسم ذات ''اللہ'' کے جلال کی وجہ سے اگر کسی انسان میں

خوف کا عنصر ایک حد سے بڑھ گیا تو اس سے قوتِ عمل سلب ہو جائے گی۔ جبکہ مطلوب یہ ہے کہ انسان ''بین الخوف والرجاء'' (خوف اور امید کے بین بین) کی کیفیت میں رہے۔ اللہ تعالیٰ سے رحمت اور مغفرت کی امید بھی رکھے اور اس کی طرف سے مسئولیت کا خوف بھی ہر وقت اسے دامن گیر رہے۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ اگر رحمٰن ہے تو وہ ذُوانْتِقام (انتقام لینے والا) بھی ہے۔ اور اگر وہ غَفّار ہے تو ساتھ ہی شَدِیدُ الْعِقَاب (سزا دینے میں بہت سخت) بھی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ساری شانیں اس کی ذات میں بیک وقت ظہور پذیر ہیں۔ گویا کامیاب انسان صرف وہ ہے جو ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرتا رہے: ﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾﴾ (النازعات) ''اور جو اپنے رب کے حضور (جواب دہی کے لیے) کھڑا ہونے سے ڈرتا رہا اور اس نے اپنے آپ کو خواہش نفس سے روکے رکھا تو یقیناً جنت ہی اُس کا ٹھکانہ ہے''۔ تو (اے نبی ﷺ!) جس شخص کے دل میں خشیت، ہو غیب میں ہونے کے باوجود اور وہ ''ذکر'' کا اتباع بھی کر رہا ہو آپ کا انذار صرف اس کے حق میں نتیجہ خیز ہوگا۔

﴿فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۱﴾﴾ ''پس آپ بشارت دے دیجیے اس کو مغفرت اور اجر کریم کی۔''

انذار و تبشیر: دو اہم اصطلاحیں

نوٹ کیجیے اس آیت میں انذار کے ساتھ تبشیر کا ذکر بھی آ گیا ہے۔ واضح رہے کہ رسولوں کے باب میں ''انذار'' اور ''تبشیر'' کی اصطلاحات بہت اہم اور بنیادی نوعیت کی ہیں۔ قرآن مجید میں یہ دونوں اصطلاحات متعدد مقامات پر ایک ساتھ آئی ہیں۔ مثلاً:

(۱) ﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ﴾ (الانعام: ۴۸، الکہف: ۵۶)
''ہم نہیں بھیجتے رسولوں کو مگر مبشر اور نذیر بنا کر۔''

(۲) ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ﴾ (النساء: ۱۶۵)
''رسولؑ (بھیجے گئے) بشارت دینے والے اور خبردار کرنے والے بنا کر تاکہ نہ رہ جائے لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت (دلیل) رسولوں کے آنے کے بعد۔''

(۳) ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝۱۰۵﴾ (بنی اسرائیل)

''اور (اے نبی ﷺ!) نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا۔''

گویا تمام رسول اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشیر اور نذیر بن کر آئے۔ وہ سرکشی کی روش اختیار کرنے والوں کو خبردار کرتے رہے کہ یہ راستہ ہلاکت کی طرف لے جانے والا ہے اور مؤمنین متقین کو ﴿فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ۝۸۹﴾ (الواقعة) کی بشارت دیتے رہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت اور جنت کی نعمتیں ان کی منتظر ہوں گی۔ آیت زیر مطالعہ کی بشارت: ﴿فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ۝۱۱﴾ بھی ایسے ہی لوگوں کے لیے ہے کہ اے نبی (ﷺ) آپ ہر ایسے شخص کو مغفرت اور اجر کریم کی بشارت دے دیجیے جو غیب میں ہوتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہتا ہے۔ لفظ کریم یہاں اَجْرٍ کی صفت کے طور پر آیا ہے۔ یعنی ایسا اجر جو بہت باعزت ہے۔ ایک وہ اجرت بھی ہوتی ہے جو اندازِ بے نیازی سے مزدور کے سامنے پھینک دی جاتی ہے' اور ایک اجرت وہ ہوتی ہے جو محنت کرنے والے کی محنت کا اعتراف کرتے ہوئے اعزاز و اکرام کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ وہ اپنے نیکوکار بندوں کو جو اجر دے گا وہ اجر کریم (باعزت اجر) ہوگا جو ان کے لیے ان کے رب نے محفوظ کر رکھا ہے۔

آیت ۱۲ ﴿اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۭ﴾ ''ہم ہی مُردوں کو زندہ کرتے ہیں (یا زندہ کریں گے) اور ہم لکھ رہے ہیں (یا لکھیں گے) جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا اور ان کے آثار کو بھی جو ان کے پیچھے رہ جانے والے ہیں۔''

''احیائے موتیٰ'' حقیقی یا معنوی؟

فعل مضارع میں چونکہ حال اور مستقبل دونوں زمانوں کا مفہوم پایا جاتا ہے' اس لیے آیت میں درج افعال کا ترجمہ حال اور مستقبل دونوں صیغوں میں کر دیا گیا ہے۔ اس آیت کے حوالے سے یہ نکتہ خصوصی طور پر لائق توجہ ہے کہ یہاں نُحْيِ الْمَوْتٰى کا ذکر پہلے آیا ہے اور نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ کی خبر بعد میں دی گئی ہے۔ حالانکہ احیائے موتیٰ کا واقعہ تو قیامت میں رونما ہوگا اور انسانوں کے اعمال اس دنیا میں لکھے جا رہے ہیں۔ چنانچہ آیت کے الفاظ کی ترتیب کے لحاظ سے بعض مفسّرین کا ذہن اس طرف گیا ہے کہ یہاں احیائے موتیٰ سے

قیامت میں مُردوں کا زندہ کرنا مراد نہیں' بلکہ ان انسانوں کا زندہ کرنا مراد ہے جو اس دنیا میں رہتے ہوئے معنوی طور پر مر چکے ہوں۔ یہ دلیل اپنے اندر بہت وزن رکھتی ہے' اس لیے کہ انسانوں کی معنوی موت کا حوالہ قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ سورۃ النمل (آیت ۸۰) میں حضور ﷺ کی دلجوئی کے انداز میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى﴾ کہ اے نبی ﷺ! آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے۔ اسی طرح حضور ﷺ کی دعوت سے مسلسل اعراض برتنے والے مشرکین کو سورۂ فاطر (آیت ۲۲) میں قبروں میں پڑے ہوئے مردوں سے تشبیہ دی گئی ہے: ﴿وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝﴾ کہ اے نبی ﷺ! آپ قبروں میں پڑے ہوئے مُردوں کو تو دعوت نہیں دے سکتے۔ یہ ابوجہل بظاہر آپؐ کو چلتا پھرتا' دیکھتا سنتا انسان نظر آتا ہے' لیکن حقیقت میں یہ حیوانِ ابوجہل ہے۔ اس کی انسانیت اس کے حیوانی وجود کے اندر دفن ہو چکی ہے' اس لیے اب یہ محض چلتا پھرتا مقبرہ ہے۔ آپؐ ایسے مردہ انسانوں سے ایمان لانے کی توقع نہ رکھیں۔ چنانچہ اس سیاق وسباق میں یہاں اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى کا مفہوم یہ ہوگا کہ جن انسانوں کی انسانیت دم توڑ رہی ہو اور جن کی روحیں موت سے دوچار ہوں' اللہ تعالیٰ اپنی اس کتاب کے ذریعے اس دنیا میں انہیں دوبارہ زندگی عطا کر دیتا ہے۔

یہ مضمون قرآن مجید کی دوتراکیب مَاۗءً مُّبٰرَكًا اور كِتٰبٌ مُّبٰرَكٌ کے مفہوم کا تقابلی انداز میں جائزہ لینے سے مزید واضح ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں بارش کے پانی سے مردہ زمین کے زندہ ہونے کی تمثیل بہت تکرار سے بیان ہوئی ہے۔ قرآن مجید بارش کے پانی کو مَاۗءً مُّبٰرَكًا (قٓ:۹) ''برکت والا پانی'' قرار دیتا ہے' جو مردہ اور بنجر زمین میں پھر سے زندگی کے ظہور کا ذریعہ بنتا ہے۔ اسی طرح سورۂ صٓ کی اس آیت میں قرآن مجید کو كِتٰبٌ مُّبٰرَكٌ کہا گیا ہے: ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۲۹﴾ ''(اے نبی ﷺ!) جو کتاب ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے' بڑی بابرکت ہے' تاکہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور اہلِ عقل سبق حاصل کریں''۔ گویا اگر بادلوں سے نازل ہونے والا مَاۗءً مُّبٰرَكًا مردہ زمین کو نئی زندگی عطا کرتا ہے تو کتابٌ مبارکٌ کی آیات کے نزول سے مردہ دلوں کو حیاتِ تازہ کی نوید ملتی ہے۔ سورۃ الحدید کی اس آیت میں مردہ زمین کے استعارے کے حوالے سے دراصل مردہ دلوں کو حیاتِ نو عطا کیے جانے ہی کی بات ہوئی ہے:

﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۱۷﴾

''جان لو کہ اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ بھی کر دیتا ہے۔ ہم نے آیات تمہارے لیے واضح کر دی ہیں تا کہ تم غور و فکر کرو۔''

یعنی اگر تم محسوس کرو کہ تمہارا دل مردہ ہو چکا ہے تو بھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ جس طرح بارش کے ذریعے مردہ زمین کی رونقیں لوٹاتا ہے اسی طرح وہ تمہارے دلوں کی مردہ زمین کو بھی پھر سے زندہ کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں یقیناً ایک بہت بڑی بشارت ہے۔ لیکن اس بشارت کا مصداق صرف وہی شخص بن سکتا ہے جو کتاب اللہ کا مطالعہ محض اپنے ذہن و خرد سے ہی نہ کرے' بلکہ اس کی آیات کے انوار سے اپنی روح کی تاریکیوں کو بھی منور کرنے کا اہتمام کرے۔ بقول علامہ اقبال ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی ' نہ صاحبِ کشاف!

اس شعر میں علامہ نے ضمیر سے انسان کی معنوی شخصیت مراد لی ہے جو اس کے جسم کے مادی غلاف میں پوشیدہ ہے۔ تو انسان کے ضمیر کی زمین پر جب قرآن مجید کے انوار کی بارش برستی ہے تو اس آبِ حیات کی برکات سے اس کے اندر ایک حیاتِ تازہ پیدا ہوتی ہے۔

اگر اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى کا مذکورہ مفہوم (مُردہ دلوں کو نئی زندگی بخشنا) مراد لیا جائے تو آیت زیر مطالعہ کا ربط گزشتہ آیت کے ساتھ بنتا ہے اور اس لحاظ سے یہ آیت تبشیر یعنی بشارت کی آیت ہے۔ مطلب یہ کہ اگر ایک گناہگار سے گنہگار انسان کے اندر بھی نیکی و بدی میں تمیز کی حس کسی نہ کسی سطح پر زندہ ہے تو وہ قرآن مجید کے انذار سے مستفید ہو سکتا ہے۔ اگر وہ اس حالت میں بھی قرآن مجید کی طرف رجوع کرے گا تو قرآن مجید کا آبِ حیات ضرور اس کے دل کی مردہ زمین کو پھر سے زندہ کر دے گا۔

﴿وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ﴾ ''اور ہم لکھ لیں گے ان کے اعمال کو جو وہ آگے بھیجیں گے اور ان کے آثار کو بھی''۔ اس فقرے میں دو طرح کے انسانی اعمال کا ذکر ہوا ہے۔ یعنی یکبارگی ''آگے'' چلے جانے والے اعمال اور اعمال کے ''پیچھے'' رہ جانے والے آثار۔ یا

در ہے کہ اسی طرح آیت ۹ میں بھی آگے اور پیچھے دو دیواروں کا تذکرہ ہے: ﴿مِنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ سَدًّا وَّمِنۡ خَلۡفِهِمۡ سَدًّا﴾ ایسا ظاہری اور معنوی توازن اس سورت کی آیات میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ بہرحال ہمارے کچھ اعمال تو ساتھ ہی ساتھ جوں کے توں ہمارے آخرت کے اکاؤنٹ میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے پیروکاروں کو اپنی کمائی آخرت کے خزانے میں جمع کرانے کی ترغیب ان الفاظ میں دی تھی:

''تم زمین پر جمع نہ کرو۔ یہاں ڈاکہ بھی پڑتا ہے' چوری بھی ہوتی ہے اور کیڑا بھی خراب کرتا ہے۔تم آسمان پر جمع کرو جہاں نہ چوری کا ڈر ہے' نہ ڈاکے کا خوف ہے اور نہ کیڑا خراب کر سکے گا۔اس لیے میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جہاں تمہارا مال ہوگا وہیں تمہارا دل ہوگا۔''

اگر کسی شخص نے اپنی محنت کی تمام تر کمائی اسی دنیا میں جمع کی ہوگی تو یقیناً اُس کا دل بھی یہیں پر اٹکا رہے گا۔ایسے شخص کے لیے دنیا کو چھوڑ جانے کا تصور بہت خوفناک ہوتا ہے۔موت کے وقت ایسے شخص کی جان بھی آسانی سے نہیں نکلتی۔ایک حدیث میں جان کنی کی تکلیف دہ کیفیت کے لیے تشبیہ دی گئی ہے کہ جیسے سیخ پر سے گرم کباب کو کھینچا جاتا ہے۔اس کے برعکس جو شخص اپنی پونجی آخرت کے خزانے میں جمع کرائے گا اس کا دل بھی ہر وقت آخرت کی فکر میں رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا شخص موت سے ڈرتا نہیں بلکہ خوشی خوشی اس کا استقبال کرتا ہے (ظاہر ہے اگر کسی شخص کا تمام تر سرمایہ پہلے سے ہی بیرونِ ملک بینکوں میں محفوظ ہو اسے ملک چھوڑنے کا کیا رنج ہوگا)۔ایسے ہی مردِ مؤمن کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا ہے: ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم   چوں مرگ آید تبسّم برلبِ اوست

یعنی میں تمہیں سچے مؤمن کی پہچان بتاتا ہوں کہ موت کا سامنا کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی ہوتی ہے۔ ایسے ہی خوش قسمت لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ﴿لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ﴾ (یونس) کی سند عطا ہوتی ہے۔

''آثار'' کی وضاحت

آیت زیرِ مطالعہ میں انسانی اعمال کی جس دوسری قسم کا ذکر ہوا ہے اس کا تعلق ''آثار'' سے ہے۔لفظ ''اثر'' کے لغوی معنی ''نقش قدم'' کے ہیں۔جس طرح زمین پر چلنے سے انسان

کے پاؤں کے نشانات زمین پر ثبت ہوتے ہیں‘ اسی طرح وہ اپنی زندگی کے سفر میں بے شمار نقوش و آثار اس دنیا میں چھوڑتا ہے۔ یوں انسان کے بعض نیک اعمال کے اثرات اس کے بعد بھی دنیا میں موجود رہتے ہیں اور ان کے حوالے سے اسے مسلسل ثواب بھی ملتا رہتا ہے۔ عرفِ عام میں ہمارے ہاں ایسے اعمال کو ''صدقہ جاریہ'' کہا جاتا ہے۔ مثلاً انسان کی نیک اولاد بھی اس کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔ کسی کی اولاد کے ذریعے دنیا میں جس جس انداز میں جہاں جہاں نیکی پھیلے گی اس کے نامہ اعمال میں اس کا ثواب درج ہوتا رہے گا۔ اس مثال کے حوالے سے میں خصوصی طور پر یہاں نبی اکرم ﷺ ''آثار'' کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ حضور ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپؐ کی معنوی اولاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ صحابہؓ کے ذریعے سے حضور ﷺ کی محنت کے اثرات پوری دنیا میں پھیل گئے اور نسل در نسل مسلسل پھیلتے چلے جائیں گے۔ امت مسلمہ میں جس کسی نے بھی نیکی اور خیر کی ترویج و اشاعت میں حصہ ڈالا ہے‘ وہ معین الدین اجمیریؒ ہوں‘ علی ہجویریؒ ہوں یا کوئی اور ہو‘ ظاہر ہے اس خیر کا منبع اور سرچشمہ تو حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس ہی ہے۔ چنانچہ یہ خیر قیامت تک جیسے جیسے پھیلے گا‘ اس کی وجہ سے حضور ﷺ کے درجات بلند سے بلند تر ہوتے چلے جائیں گے۔

بعض اہل علم کے نزدیک آیت زیر مطالعہ کے لفظ آثار کا اطلاق انسانی اعمال کے ظاہری و مادی اثرات (physical effects) پر بھی ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص نماز پڑھنے کے لیے مسجد جاتا ہے تو زمین پر جہاں جہاں اس کے قدم پڑتے ہیں وہ اس کے ''آثار'' ہیں۔ بظاہر تو یونہی لگتا ہے کہ ان قدموں کے نشانات مٹ گئے ہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسے تمام نشانات محفوظ رہیں گے اور قیامت کے دن اس کی عدالت میں متعلقہ شخص کے حق میں گواہی دیں گے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ انصار میں سے قبیلہ بنو سلمہ مسجد نبویؐ سے دور آباد تھا۔ مسجد نبویؐ کے قریب چند قطعات خالی تھے‘ انہوں نے نقل مکانی کر کے مسجد نبویؐ کے قریب آباد ہونے کا ارادہ کیا۔ نبی اکرم ﷺ کے علم میں یہ بات آئی تو آپؐ نے ان سے فرمایا: ((یَا بَنِی سَلِمَةَ دِیَارَکُمْ، تُکْتَبْ آثَارُکُم))[1] ''اے

---

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ‘ باب فضل کثرۃ الخطا الی المساجد‘ ح: ٦٦٥

بنی سلمہ! اپنی رہائش گاہوں میں ہی مقیم رہو' تمہارے نشاناتِ قدم لکھے جاتے ہیں۔'' اس وقت میری آواز بظاہر سامنے بیٹھے ہوئے چند لوگ ہی سن رہے ہیں اور اس کے بعد بظاہر یہ آواز ہوا میں تحلیل ہو کر معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آواز ختم ہونے والی نہیں ہے۔ اللہ کے ہاں اسے ریکارڈ کیا جا رہا ہے۔ (ممکن ہے آئندہ کسی زمانے میں انسان بھی ہزاروں سال پرانی صوتی لہروں کو ریکارڈ کرنے کی استعداد حاصل کر لے)۔ اسی طرح ہمارے ایک ایک عمل کے نقوش و اثرات اللہ تعالیٰ کے ہاں ریکارڈ ہو رہے ہیں اور قیامت کے دن ہر انسان کی زندگی کی پوری فلم کھول کر اس کے سامنے رکھ دی جائے گی' جسے دیکھ کر انسان چیخ اٹھے گا: ﴿مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ۚ﴾ (الکھف: ۴۹) کہ یہ کیسا ریکارڈ ہے جس میں نہ کسی چھوٹی چیز کو نظر انداز کیا گیا ہے اور نہ کسی بڑی چیز کو' بلکہ ہر چیز کا احاطہ کر لیا گیا ہے! سورۃ الزلزال میں اس ریکارڈنگ کا ذکر بایں الفاظ آیا ہے: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝﴾ ''جس کسی نے ذرے کے ہم وزن نیکی کی ہوگی' وہ اسے دیکھ لے گا' اور جس کسی نے ذرے کے ہم وزن بدی کمائی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔''

بہرحال اگر تو ''احیائے موتیٰ'' کا مذکورہ مفہوم (مُردہ دلوں کو نئی زندگی عطا کرنا) مراد لیا جائے تو اس آیت کا مضمون گزشتہ آیت (آیت ۱۱) کے ساتھ مل کر مکمل ہوتا ہے۔ اور گزشتہ آیت میں چونکہ مغفرت اور اجر کریم کی بشارت کا ذکر ہے اس لیے ربطِ مضمون کے تحت زیر مطالعہ آیت کے الفاظ میں نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ سے صرف نیک اعمال اور نیک اعمال کے آثار ہی مراد لیے جائیں گے۔ اس مضمون اور مفہوم کے مطابق یہ گویا بشارت کی آیت ہے۔ لیکن اگر نُحْيِ الْمَوْتٰى سے وہ ''احیائے موتیٰ'' مراد لیا جائے جس کا ظہور قیامت کے دن ہوگا تو پھر نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ کا عام مفہوم مراد لیا جائے گا۔ یعنی یہ کہ انسان کے اچھے برے سب کے سب اعمال اور ان کے اثرات کو ریکارڈ کیا جا رہا ہے۔ جس انسان کی نیکی کے اثرات دنیا میں جہاں جہاں پہنچیں گے وہ اس کے لیے ماجور ہوگا اور جس کی برائی جس جس رنگ میں اپنے اثرات دکھائے گی اسے اس کا حساب دینا ہوگا۔ اس مفہوم میں یہ آیت گویا ''انذار'' کی آیت ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے اس آیت کا ربط گزشتہ تمام آیات کے

مضمون کے ساتھ ہوگا۔ اور اگر اِنَّا نَحْنُ نُحْیِ الْمَوْتٰی کے مذکورہ دونوں مفاہیم اکٹھے ایک ساتھ مراد لیے جائیں (دونوں مفاہیم بیک وقت بھی درست ہیں۔ اور الفاظ کی یہ جامعیت اور معنویت بھی قرآن کے اعجاز کا ایک پہلو ہے۔) تو اس آیت میں انذار کا رنگ بھی نظر آئے گا اور تبشیر کا انداز بھی۔

﴿وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿١٢﴾﴾ ''اور ہر چیز کا ہم نے احاطہ کیا ہوا ہے ایک ایسی کتاب میں جو بڑی روشن اور واضح ہے۔''

اَحْصٰی کے معنی احاطہ اور گھیراؤ کرنے کے ہیں۔ یہ وہی لفظ ہے جو سورۃ الکہف کی مذکورہ بالا آیت (آیت ۴۹) میں ''اَحْصٰهَا'' کی شکل میں آیا ہے۔ یعنی کوئی چیز یا کسی انسان کا کوئی عمل ایسا نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے دائرۂ علم سے باہر ہو۔

''اِمَامٍ'' سے یہاں تمام انسانوں کا اجتماعی اعمالنامہ مراد ہے۔ لغوی مفہوم کے مطابق ''امام'' وہ چیز یا شخصیت ہے جس کا قصد کیا جائے۔ ہم انسانوں کے ہاں جس شخص کو امام مانا جاتا ہے اس کی شخصیت کو ہر وقت' ہر جگہ مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ کسی مجلس میں سب لوگوں کی توجہ اپنے امام پر مرتکز ہوتی ہے' سب کا رخ اُسی کی طرف ہوتا ہے۔ بالکل یہی حیثیت انسانوں کے لیے اس کتاب (اعمال نامے) کی ہے جس میں ان کے آگے بھیجے ہوئے اعمال اور ان اعمال کے پیچھے رہ جانے والے آثار کا اندراج ہو رہا ہے۔ اس دنیا میں ہر انسان اپنے اپنے انداز میں زندگی گزار رہا ہے' لیکن ہر ایک کا رخ اس اعمالنامے کی طرف ہے۔ سب انسان چار و ناچار' کشاں کشاں اسی کی طرف کھنچے چلے جا رہے ہیں۔ ہر انسان کی زندگی میں اٹھنے والا ہر قدم اور اس کی مہلت عمر کا گزرنے والا ہر لمحہ اسے اس اعمالنامے سے قریب تر کر رہا ہے۔ اس اعمالنامے میں تمام انسانوں کے تمام اعمال کا احاطہ کر لیا گیا ہے اور قیامت کے دن میدانِ حشر میں اسے کھول کر سب کے سامنے رکھ دیا جائے گا: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ﴿٧﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴿٨﴾﴾ ''پھر جس کسی نے ذرے کے ہم وزن نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا' اور جس کسی نے ذرے کے ہم وزن بدی کمائی ہوگی تو وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔''

یہاں پہلا رکوع اختتام پذیر ہوا۔ اس رکوع میں ہمیں انذار اور تبشیر کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

رکوع ۲

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۚ﴿۱۳﴾ اِذْ اَرْسَلْنَآ
اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالُوْا مَآ
اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا
تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾ قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ
الْمُبِيْنُ ﴿۱۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸﴾ قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ۭ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ
مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا
الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۰﴾ ۙ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ
الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۲﴾ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ
الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ۚ﴿۲۳﴾ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ
ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾ ۭ قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۭ قَالَ
يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ ۙ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۷﴾ وَمَآ
اَنْزَلْنَا عَلٰي قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنْ
كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ﴿۲۹﴾ يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا
يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۰﴾ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ
مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۳۱﴾ ۭ وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا
مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۲﴾

''بستی والوں'' کی عبرت آموز مثال

اس رکوع کے مضامین کو سمجھنے کے لیے بنیادی طور پر یہ نکتہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس سورۂ مبارکہ کا نزول مکی دور کے وسطی زمانہ میں اُس وقت ہوا' جب ایک طرف حضور ﷺ غیر معمولی استقامت کے ساتھ اپنی دعوت کا علم بلند کیے ہوئے تھے تو دوسری طرف آپؐ کی مخالفت بھی زوروں پر تھی۔ اس طرح فریقین کے درمیان کشمکش اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور بادی النظر میں

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اہل مکہ حضور ﷺ کی دعوت کو مکمل طور پر مسترد کر چکے ہیں۔ پہلے رکوع کی اس آیت میں ہمیں ان حالات کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے: ﴿لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۷﴾ کہ ان لوگوں کی اکثریت پر اللہ تعالیٰ کا قول واقع ہو چکا ہے' چنانچہ اب یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا وہ فیصلہ ان لوگوں پر لاگو ہو چکا ہے جو اُس نے ابلیس کو زمین پر بھیجتے ہوئے سنایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کی مہلت کی درخواست قبول کرتے ہوئے اس پر واضح فرما دیا تھا: ﴿لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۸۵﴾ (ص) ''میں تجھ سے اور تیرے پیروکاروں سے جہنم کو بھر کے رہوں گا۔''

مذکورہ صورت حال میں مکہ کے ماحول پر بظاہر گہری مایوسی کی کیفیت طاری تھی۔ چنانچہ زیر مطالعہ آیات میں ''بستی والوں'' کی جس مثال کا ذکر ہے اسے اسی تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ رزمِ حق و باطل کی تاریخ سے یہ مثال دراصل حضور ﷺ اور اہل ایمان کی دلجوئی کے لیے بیان کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس مثال میں خصوصی طور پر حضور ﷺ کے اہل ایمان ساتھیوں کے لیے راہنمائی بھی ہے کہ تم لوگ اس وقت یقیناً بہت سخت حالات سے گزر رہے ہو' لیکن یاد رکھو کہ علَم بردارانِ حق کے ساتھ ایسا پہلی مرتبہ نہیں ہو رہا' بلکہ ماضی کے تمام انبیاء و رسل علیہم السلام اور ان کے پیروکاروں کو بھی ایسے ہی مایوس کن اور تکلیف دہ حالات کا سامنا کرنا پڑتا رہا ہے۔ ماضی میں ہر رسولؑ کے پیروکاروں پر ایک ایسا دور ضرور آیا' جب انہیں محسوس ہوا کہ اب شاید تمام داعیانِ حق کو ملیا میٹ کر دیا جائے گا اور دعوتِ حق کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو جائے گا۔ لیکن بالآخر ہر مرتبہ ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت نے رسولوںؑ اور ان کے پیروکاروں کی دستگیری فرمائی اور منکرین حق کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ چنانچہ ان آیات میں ''گفتہ آید در حدیثِ دیگراں'' کے انداز میں ایک مثال کے ذریعے اہل حق کی راہنمائی اور حوصلہ افزائی فرمائی جا رہی ہے:

آیت ۱۳ ﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝۱۳﴾

''آپ بیان کیجیے ان کے لیے ایک بستی والوں کی مثال' جبکہ آئے اس کی طرف رسول۔''

مُرْسَلُوْنَ یہاں مُرْسَلٌ کی جمع کے طور پر آیا ہے جو اَرْسَلَ' یُرْسِلُ' اِرْسَالاً سے اسم المفعول ہے۔ مُرْسَلٌ کے معنی ہیں بھیجا ہوا' یعنی فرستادہ۔ اگلی آیت میں ان رسولوں کی تعداد

کا ذکر بھی ہے۔ یہ کون سی بستی کا واقعہ ہے؟ اس سوال کو وقتی طور پر آپ اپنے ذہن سے نکال دیجیے۔ ایک تو اس لیے کہ یہاں اس حوالے سے جو حالات و واقعات بیان ہوئے ہیں وہ تقریباً تمام انبیاء و رسل علیہم السلام پر صادق آتے ہیں اور دوسرے اس لیے بھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے یہاں بستی اور رسولوں کا نام ظاہر نہیں فرمایا تو اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جو پیغام یہاں دینا مقصود ہے اس کے حوالے سے واقعہ کے اس پہلو کی چنداں اہمیت نہیں۔ لہٰذا اس ضمن میں ہمیں بھی خواہ مخواہ کھود کرید کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اکثر و بیشتر مفسّرین نے چونکہ اس بارے میں اپنی اپنی آراء کا اظہار کیا ہے' اس لیے ان سطور میں اس موضوع کو بھی زیر بحث لایا جائے گا' لیکن اصل مضمون پر گفتگو کرنے کے بعد۔ تو آیئے پہلے ہم یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس واقعہ یا مثال میں داعیانِ حق کے لیے اصل پیغام کیا ہے۔

آیت ۱۴ ﴿اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾﴾ ''جبکہ ہم نے بھیجا ان کی طرف پہلے دو (رسولوں) کو' پس انہوں نے ان دونوں کو جھٹلا دیا' تو ہم نے (ان کو) قوت بخشی ایک تیسرے (رسول) کے ذریعے سے' تو انہوں نے کہا کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں۔''

یعنی اس بستی میں تین رسول بھیجے گئے۔ یہاں پر جمع کے صیغے (فَقَالُوْا اور مُرْسَلُوْن) بھی نشاندہی کر رہے ہیں کہ ان کی تعداد کم از کم دو سے زیادہ تھی۔ پہلے مرحلے میں اس بستی والوں کی طرف دو رسول آئے' جو ان کی ہدایت و راہنمائی کے لیے اپنی سی کوششیں کرتے رہے' لیکن وہ قوم اعراض و انکار پر اڑی رہی۔ جب ان کی ہٹ دھرمی کا معاملہ ایک حد سے آگے بڑھ گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس بستی میں ایک اور رسول کو بھیجا' لیکن وہ لوگ انہیں جھٹلانے پر بضد رہے۔

آیت ۱۵ ﴿قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾ ''انہوں نے کہا نہیں ہو تم مگر ہمارے ہی جیسے انسان اور کچھ بھی نازل نہیں کیا رحمٰن نے' بلکہ تم تو محض جھوٹ بولتے ہو۔''

رسالت اور بشریت میں کوئی تضاد نہیں!

اس قوم کے لوگوں کا رسولوں پر بنیادی اعتراض یہ تھا کہ تم تو ہمارے ہی جیسے انسان ہو' تم

اللہ کے رسول کیسے ہو سکتے ہو؟ واضح رہے کہ اپنے رسولوں کو یہ جواب صرف اسی بستی کے لوگوں نے نہیں دیا تھا' بلکہ ہر دور میں تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کو اپنی اپنی قوموں کی طرف سے اس اعتراض کا سامنا کرنا پڑتا رہا۔ گویا نسل انسانی نے آسمانی ہدایت کے سلسلے میں سب سے بڑی ٹھوکر یہ کھائی کہ لوگ بحیثیت مجموعی نبوت اور بشریت کو ایک دوسرے سے متضاد سمجھتے رہے۔ اس ضمن میں ہر زمانے کے لوگوں کی عمومی رائے یہی رہی کہ اللہ کا رسول عام انسانوں سے مختلف قسم کی مخلوق ہونا چاہیے۔ اسے سب کی نظروں کے سامنے آسمانوں سے اترنا چاہیے تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ واقعی اسے اللہ نے بھیجا ہے۔ چنانچہ ہر دور اور ہر قوم کے لوگوں کی اکثریت یہی سمجھتی رہی کہ کوئی بشر اللہ کا رسول نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے مشرکین مکہ کی طرف سے حضور ﷺ پر بھی اس طرح کی پھبتیاں چست کی گئیں: ﴿وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ﴾ (الفرقان:۷) ''اور انہوں نے کہا کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا بھی کھاتا ہے اور گلیوں بازاروں میں گھومتا پھرتا بھی ہے''۔ مطلب یہ کہ محمد (ﷺ) تو ہمارے سامنے پیدا ہوئے۔ ہمارے سامنے ہی ان کے بچپن' لڑکپن اور جوانی کے ادوار گزرے۔ ہم نے انہیں بکریاں چراتے اور کاروبار کرتے بھی دیکھا۔ پھر عام انسانوں کی طرح انہوں نے شادی کی اور ان کی اولاد بھی ہوئی۔ جب ان کی زندگی کے تمام معاملات ہمارے جیسے ہی ہیں تو آخر ہم کیسے مان لیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں؟

ان لوگوں کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ حضور ﷺ کی بشری حیثیت تو ان کے سامنے تھی۔ وہ لوگ آپ کو عبداللہ کے بیٹے اور عبدالمطلب کے پوتے کی حیثیت سے تو جانتے تھے' لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ آپ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ جبکہ محمد بن عبداللہ (ﷺ) کو محمد رسول اللہ بنانے والی اصل چیز تو ''وحی'' تھی اور وحی کا تعلق عالم غیب سے ہے۔ ظاہر ہے وحی عَلٰى رُءُوْسِ الْاَشْهَادِ (گواہوں کی موجودگی میں) تو نازل نہیں ہوتی اور نہ ہی لوگ فرشتے کو نازل ہوتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء و رسل علیہم السلام کو ان کی نبوت و رسالت کے ثبوت کے طور پر مخصوص معجزات دیے گئے' جنہیں وہ لوگوں کے کہنے پر بطور ثبوت پیش کرتے رہے۔ جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا جواب مذاق اور تمسخر کے انداز میں دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فوراً کہا: ﴿اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ۝۳۰﴾ کہ اگر میں

تجھے کوئی واضح نشانی دکھا دوں تو کیا تم پھر بھی میری بات نہیں مانو گے؟ اس نے جواب دیا: ﴿فَاْتِ بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۳۱﴾ (الشعراء) کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو اس کی سند اور دلیل پیش کرو۔ فرعون کے اس چیلنج کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فوراً عصا اور یدِ بیضا کے دو معجزات پیش کر دیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان معجزات کو قرآن میں بُرهَانَان (دو سندیں یا دو دلیلیں) کہا گیا ہے۔

اہلِ مکّہ انبیاء و رسل علیہم السلام کے معجزات کی تاریخ سے بخوبی آگاہ تھے' اسی لیے وہ لوگ حضور ﷺ سے بار بار ثبوت مانگتے تھے اور آپؐ سے حسّی معجزات کا مطالبہ کرتے تھے۔ سورۂ بنی اسرائیل (رکوع ۱۰) میں اہل مکہ کے چند ایسے مطالبات کا ذکر بھی آیا ہے۔ مثلاً یہ کہ:

(i) آپ مکہ کی سنگلاخ زمین سے فوری طور پر ایک چشمہ جاری کر کے دکھائیں۔ یا

(ii) اپنے لیے انگوروں اور کھجوروں کا ایک باغ پیدا کر کے دکھائیں جس میں ندیاں بھی بہہ رہی ہوں۔ یا

(iii) ہم پر عذاب کے طور پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دیں۔ یا

(iv) اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آئیں۔ یا

(v) اپنے لیے سونے کا ایک گھر بنا کر دکھائیں۔ یا

(vi) ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ جائیں اور وہاں سے ہمارے دیکھتے ہوئے ''کتاب'' لے کر آئیں۔

غرض انہوں نے اپنے مطالبات کی باقاعدہ فہرست بنا رکھی تھی کہ آپؐ ان میں سے کوئی ثبوت پیش کریں تو ہم آپؐ کی نبوت کو مان لیں گے۔ لیکن حضور ﷺ کے پاس ان تمام مطالبات کا ایک ہی جواب تھا: ﴿اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ﴾ (الکہف: ۱۱۰) کہ میں تو تم جیسا ایک بشر ہوں' البتہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے۔ اسی وحی کی بنیاد پر میں اللہ تعالیٰ کا کلام اور پیغام تم لوگوں کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ لیکن اہلِ مکّہ آپ ﷺ کی اس دلیل کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھتے تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس ضمن میں حضور ﷺ کو کس قدر مشکل صورت حال کا سامنا تھا۔ بلکہ سورۃ الانعام کی آیت ۳۵ کے طرزِ تخاطب سے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید کسی وقت طبع بشری کے تقاضے کے تحت خود حضور ﷺ کے دل میں

بھی یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ یہ لوگ اگر معجزات کے مطالبے کے بہانے میرے خلاف حجت قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس بنیاد پر عوام الناس کو گمراہ کر رہے ہیں تو انہیں ان کے مطالبے کے مطابق کوئی معجزہ دکھا دیا جانا چاہیے۔ اس سیاق وسباق میں حضور ﷺ کے ایک پھوپھی زاد بھائی (جو آپؐ کی پھوپھی عاتکہ کا بیٹا تھا) کا واقعہ اکثر تفاسیر میں نقل ہوا ہے۔ وہ آپؐ سے بہت محبت کرتا تھا اور ہر طرح سے آپؐ کا ساتھ دیتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کے سامنے قریش نے حضور ﷺ سے ایسے کئی مطالبات کیے اور ان کے ہر مطالبے پر آپؐ یہی جواب دیتے رہے کہ نبوت کے حوالے سے کوئی ثبوت یا نشانی دکھانا میرے اختیار میں نہیں۔ نہ تو مجھے خدائی کا دعویٰ ہے! نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ ہی میرے قبضے میں غیب کے خزانے ہیں ..... آپؐ کا وہ پھوپھی زاد بھائی یہ بحث سنتا رہا اور بالآخر یہ کہہ کر آپؐ کو چھوڑ کر چل دیا کہ اے محمد (ﷺ) آپؐ کی قوم نے آپؐ پر حجت قائم کر دی ہے۔ اب میں آپؐ کا ساتھ نہیں دے سکتا —— اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب اگلی آیت کی تلاوت کیجیے:

آیت ۱۶ ﴿قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾﴾ ''ان رسولوں نے کہا کہ ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم یقیناً تمہاری طرف بھیجے ہوئے ہیں۔''

کہ ہمارے پاس پیش کرنے کے لیے اس سے بڑی دلیل اور کوئی نہیں ہے۔

آیت ۱۷ ﴿وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۷﴾﴾ ''اور نہیں ہے ہم پر کوئی ذمہ داری سوائے صاف صاف پہنچا دینے کے۔''

ہماری ذمہ داری آپ لوگوں تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دینے کی حد تک ہے۔ ہم آپ سے اپنی بات منوانے اور آپ کو راہِ ہدایت پر لانے کے مکلّف نہیں ہیں' اور نہ ہی ہم اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں مسئول ہوں گے۔

''بلاغِ مبین'' کے حقیقی تقاضے

فریضۂ دعوت وتبلیغ کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا یہ قانون داعیانِ حق کے لیے بلاشبہ بہت حوصلہ افزا ہے۔ لیکن ایک داعی کے لیے بَلَاغٌ مُّبِيْنٌ کی قرآنی اصطلاح کے اصل مفہوم اور حقیقی تقاضوں سے کماحقہٗ آگاہ ہونا بھی انتہائی ضروری ہے۔ ہمارے ہاں اکثر وبیشتر واعظین کا معمول ہے کہ وہ اپنی تقریر کے اختتام پر یہ آیت پڑھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ کسی واعظ یا مقرر کا

اپنی تقریر کے اختتام پر فیصلہ کن انداز میں ''وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ'' کہنا اس کی طرف سے گویا اس اعلان کے مترادف ہے کہ اس نے یہ تقریر کر کے اپنا فرضِ منصبی ادا کر دیا ہے۔ اگرچہ ''ابلاغ'' کا ایک درجہ تو یہ بھی ہے کہ کوئی کسی کے کان تک اپنی بات پہنچا دے۔ لیکن اس طرح لٹھ مار انداز میں ایک مرتبہ بات کہہ کر فارغ ہو جانا یقیناً ''بلاغِ مبین'' کے زمرے میں نہیں آتا۔ بلاغ مبین دراصل دعوت و تبلیغ کا وہ درجہ ہے جہاں مخاطب کا دل پکار اٹھتا ہے کہ ہاں یہ بات حق ہے۔ اگر مسئلہ محض پیغام دعوت کو لوگوں کے کانوں تک پہنچا دینے کا ہی ہوتا تو رسولوں کو اتنے کھکھیڑ برداشت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ظاہر ہے مکہ کی چھوٹی سی بستی میں حضور ﷺ کی دعوت تمام لوگوں کے کانوں تک تو چند ہی دنوں میں پہنچ گئی ہو گی۔ لیکن ''بلاغ مبین'' کا تقاضا پورا کرنے میں آپؐ کو بارہ سال لگے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی دعوت کو بلاغ مبین کے درجے تک پہنچانے کے لیے کیا کیا مراحل طے کیے' اس کا نقشہ سورۂ نوح کی ان آیات میں دکھایا گیا ہے:

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا ۝۵ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْٓ اِلَّا فِرَارًا ۝۶ وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝۷ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝۸ ثُمَّ اِنِّیْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝۹ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝۱۰﴾

''نوحؑ نے عرض کیا: اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کو رات دن دعوت دی۔ مگر میری دعوت سے ان کے فرار میں ہی اضافہ ہوا۔ اور میں نے جب بھی انہیں بلایا تا کہ تو انہیں معاف کر دے تو انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑے (اپنے منہ پر) اوڑھ لیے' وہ اپنی روش پر اڑ گئے اور تکبر کی انتہا کر دی۔ پھر میں نے انہیں برملا دعوت دی۔ پھر میں نے انہیں اعلانیہ بھی بتایا اور چپکے چپکے بھی سمجھایا' کہ اپنے رب سے معافی مانگ لو' بلاشبہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔''

بہرحال فریضہ دعوت کے حوالے سے ''بلاغِ مبین'' کا تقاضا یہ ہے کہ مخاطبین میں سے جن لوگوں کے اندر حیاتِ معنوی کی کوئی رمق باقی ہو اور ان کی انسانیت کسی نہ کسی درجے میں زندہ ہو (اس سے وہ لوگ یقیناً مستثنیٰ ہوں گے جنہیں قرآن نے مردہ کہا ہے اور جن کی

انسانیت ان کے حیوانی وجود کے اندر دفن ہو چکی ہے) ان کے دل گواہی دینے لگیں کہ ہاں حق یہی ہے۔ دل اور ضمیر کی اس گواہی کے بعد وہ لوگ اگر اپنی سیادتوں اور چودھراہٹوں کو بچانے کے لیے یا اپنے نام نہاد مفادات وتعصّبات کی بنیاد پر اپنی زبانوں سے برملا حق کی گواہی نہ دیں تو وہ الگ بات ہے۔

''بلاغِ مبین'' کے بارے میں ایک نکتہ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ یہ ایک ''معیّن'' ذمہ داری ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی داعی پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن اگر متعلقہ فرد نے اس ضمن میں مطلوبہ حد سے زیادہ ذمہ داری اپنے اوپر اوڑھنے کی کوشش کی تو یہ اس کی بہت بڑی خطا ہوگی اور اس کی وجہ سے وہ یقیناً ٹھوکر کھائے گا۔ کیونکہ ایک داعی کی ذمہ داری دعوت کے پیغام کو صاف صاف انداز میں پہنچا دینے کی حد تک ہے' لوگوں کو ہدایت پر لانے کا وہ مکلّف نہیں۔ اسے اسی حد میں رہتے ہوئے ''بلاغِ مبین'' کا حق ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جو کہ بذاتِ خود ایک انتہائی مشکل' صبر آزما اور جاں گداز جدّوجُہد ہے۔

آیت ۱۸ ﴿قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۸﴾ ''وہ کہنے لگے کہ ہم تو تمہیں منحوس سمجھتے ہیں' اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمہیں ضرور سنگسار کر دیں گے اور ہمارے ہاتھوں تمہیں المناک سزا ملے گی۔''

اللہ تعالیٰ کی سُنّت کا اعادہ

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی اس سنت کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی طرف کسی رسول کو بھیجتا تو اس قوم کے لوگوں کو جھنجھوڑنے اور خوابِ غفلت سے جگانے کے لیے انہیں چھوٹی چھوٹی تکلیفوں اور آزمائشوں میں مبتلا کر دیتا۔ جیسا کہ سورۃ الانعام کی اس آیت میں فرمایا گیا: ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۝۴۲﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ سے پہلی قوموں کی طرف بھی ہم نے رسول بھیجے پھر ہم نے انہیں سختیوں اور تکلیفوں میں مبتلا کیا تاکہ ان کے اندر عاجزی پیدا ہو جائے۔''

سورۃ الاعراف میں یہ مضمون زیادہ تاکیدی انداز میں آیا ہے۔ (واضح رہے کہ سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف میں باہم جوڑے کا تعلق ہے) جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس قانون سے کسی قوم کو استثناء نہیں ملا۔ ملاحظہ ہو سورۃ الاعراف کی یہ آیت: ﴿وَمَآ

اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾ ''اور ہم نے نہیں بھیجا کسی بھی بستی میں کسی بھی نبی کو مگر یہ کہ ہم نے پکڑا اُس کے بسنے والوں کو سختیوں سے اور تکلیفوں سے تا کہ وہ گڑگڑائیں (اور ان کے اندر عاجزی پیدا ہو جائے)۔''

لفظ ''اَلْبَاْسَاء'' کا اطلاق فقر و فاقہ کی صورت حال پر ہوتا ہے۔ جیسے فصلوں کا تباہ ہو جانا' خشک سالی کی کیفیت پیدا ہو جانا وغیرہ۔ جبکہ ''اَلضَّرَّاء'' کے معنی جسمانی تکلیف کے ہیں۔ جیسے کسی وبائی مرض کا پھوٹ پڑنا۔ ظاہر ہے جب انسان آرام و سکون کی زندگی بسر کر رہا ہو تو وہ ذہنی طور پر موت' آخرت' احتساب وغیرہ سے متعلق باتیں سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ عام انسانی نفسیات یہی ہے کہ:۔

اب تو آرام سے گزرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے!

اس کے برعکس جب انسان پر کوئی پریشانی یا مصیبت آتی ہے تو ایسی کیفیت میں وہ خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ بہرحال لوگوں کو مصائب و تکالیف میں مبتلا کرنے سے مطلوب تو یہ تھا کہ ان میں عاجزی و انکساری اور اللہ تعالیٰ کی طرف انابت کا رجحان پیدا ہو' لیکن اس کے برعکس ہوتا یہ رہا کہ متعلقہ قوم کے لوگ اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں کی وجہ سے رسولوں کو منحوس کہنا شروع کر دیتے۔ وہ رسولوں سے کہتے کہ یہ سب کچھ تمہاری نحوست کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ ہم اپنے گھروں میں امن' سکون اور خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے' لیکن جب سے تم نے دعوت و تبلیغ کا یہ کام شروع کیا ہے اس وقت سے ہمارے حالات بالکل ہی بدل گئے ہیں۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ میں متعلقہ قوم کے لوگوں کا نحوست سے متعلق قول (قَالُوْٓا اِنَّا تَطَیَّرْنَا بِكُمْ) اسی حوالے سے نقل ہوا ہے' کہ تمہارا وجود ہمارے لیے نحوست کا باعث بن گیا ہے۔

آیت ۱۹ ﴿قَالُوْا طَآىِٕرُكُمْ مَّعَكُمْ ؕ اَىِٕنْ ذُكِّرْتُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾﴾ ''وہ کہنے لگے تمہاری نحوست تو تمہارے اپنے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ کیا اس لیے کہ تمہیں نصیحت کی گئی ہے (تم اسے نحوست سمجھتے ہو)؟ بلکہ تم ہو ہی حد سے گزرے ہوئے لوگ۔''

رسولوں نے فرمایا کہ تمہاری نحوست تو تمہارے اپنے نظریات و اعمال کی وجہ سے ہے۔ یہ تمہارے اپنے ہی کرتوت ہیں جو تکلیفوں اور پریشانیوں کی صورت میں تمہارے سامنے آ رہے

ہیں۔ ظاہر ہے انبیاء و رسل علیہم السلام تو گمراہ قوموں کی طرف ہی مبعوث ہوتے تھے' تا کہ اللہ تعالیٰ کے آخری عذاب سے پہلے ان پر اتمام حجت کر دیا جائے۔

﴿اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ﴾ تو کیا تمہارا یہ ردعمل اس وجہ سے ہے کہ تمہیں نصیحت کی جا رہی ہے؟ کیا تم لوگ نحوست اور بدشگونی کو ہماری طرف اس لیے منسوب کر رہے ہو کہ ہم تمہیں نصیحت کر رہے ہیں اور تمہیں ہدایت کی طرف بلا رہے ہیں؟ ﴿بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾﴾ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تم خود ہی حد سے تجاوز کرنے والے لوگ ہو۔ تم نے حدِ بندگی سے نکل کر سرکشی کی روش اختیار کر لی ہے۔

نافرمان قوم کے لیے اَلٹی میٹم

ان آیات کے اسلوب و انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں متعلقہ قوم کی طرف سے رسولوں کو دیے جانے والے آخری اَلٹی میٹم کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہ مرحلہ دراصل تمام رسولوںؑ کی زندگیوں میں آتا رہا ہے۔ دعوت کے آغاز میں تو متعلقہ قوم کے لوگ عام طور پر محض تمسخر اور استہزاء پر اکتفا کرتے۔ اس مرحلے میں شاعر' مجنون' جادوگر وغیرہ کہہ کر فقرے چست کیے جاتے۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ وہ دور آتا جب قوم کی طرف سے ایک فیصلہ کن اقدام کے لیے اللہ کے رسول کو آخری اَلٹی میٹم دے دیا جاتا۔

حضور ﷺ کے ساتھ یہ معاملہ اس وقت پیش آیا جب قریش کے ایک وفد نے بہت سنجیدہ انداز میں جناب ابوطالب سے مطالبہ کیا کہ یا تو آپ ہمارے اور اپنے بھتیجے کے درمیان سے نکل جائیں یا پھر ہمارے خلاف سیدھی طرح میدان میں آئیں۔ اب ہم یہ سب کچھ مزید برداشت نہیں کر سکتے' ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے — اس پر جناب ابوطالب نے حضور ﷺ کو بلا کر سمجھانے کی کوشش کی کہ میرے پیارے بھتیجے! مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جسے میں برداشت نہ کر سکوں۔ شفیق چچا کی یہ بات سن کر حضور ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ آنسو دراصل بشری و انسانی جذبات و احساسات کا مظہر تھے' لیکن دل کے اندر عزیمت و استقامت کا کوہ ہمالیہ بدستور موجود تھا۔ (ایسے ہی حضور ﷺ کی آنکھوں میں اس وقت بھی آنسو آئے تھے جب آپؐ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تھا۔ اس وقت صحابہؓ کے استفسار پر آپؐ نے فرمایا تھا کہ یہ آنسو دراصل اس رحمت کا مظہر ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے دلوں میں

رکھ دی ہے۔ لیکن ہماری زبان پر یہی الفاظ ہوں گے کہ جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے ہم بھی اسی پر راضی ہیں)۔ چنانچہ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ چچا جان! یا تو یہ بات پوری ہو کر رہے گی' یا میں اسی میں اپنے آپ کو ہلاک کر لوں گا۔ میرے لیے اب تیسرا راستہ کوئی نہیں ہے۔

گزشتہ آیت (آیت ۱۸) میں بھی رسولوں کے لیے متعلقہ قوم کے ایسے ہی فیصلہ کن الٹی میٹم کا ذکر ہے' کہ تم لوگ اس مہم جوئی سے باز آ جاؤ' ورنہ جان سے جاؤ گے۔ یہاں یہ نکتہ خصوصی طور پر لائق توجہ ہے کہ قوم کے اس اُلٹی میٹم کے جواب میں رسولوں کی طرف سے کسی قسم کے ضعف کا اظہار نہیں ہوا' بلکہ انہوں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ تم لوگوں کو دراصل اپنی ہی نحوست کا سامنا ہے۔ تم اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے مصائب و آلام میں گرفتار ہوئے ہو' اس لیے کہ تم حد سے گزرنے والے سرکش لوگ ہو۔ اب ظاہر ہے کہ رسولوں کے اس جواب کے نتیجے میں ماحول میں تناؤ میں اضافہ ہو گیا ہو گا اور صورت حال مزید کشیدہ ہو گئی ہو گی۔ مگر اس سے پہلے کہ قوم کی طرف سے کسی فیصلہ کن اقدام کا آغاز ہوتا' عین آخری لمحے پر اس قوم میں سے ایک صاحب درمیان میں آ گئے:

آیت ۲۰ ﴿وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ۝۲۰﴾ ''اور شہر کے پرلے کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا: اے میری قوم کے لوگو! ان رسولوں کی پیروی کرو۔''

بندۂ مؤمن کی پکار

گویا وہ شخص پہلے ہی ایمان لا چکا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اُس وقت تک اس نے اپنے ایمان کا معاملہ مخفی رکھا ہو۔ لیکن جب اس نے سنا کہ اس کی قوم کے لوگ رسولوں کے خلاف انتہائی اقدام کرنے پر تُل گئے ہیں تو اس نے مؤمنِ آلِ فرعون کی طرح علی الاعلان میدان میں آنے کا فیصلہ کر لیا۔ مؤمنِ آلِ فرعون کا واقعہ سورۃ المؤمن میں بہت تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ ان کا تعلق فرعون ہی کی قوم سے تھا' وہ اس کے دربار میں انتہائی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بہت پہلے ایمان لا چکے تھے' لیکن: ﴿يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗ﴾ (المؤمن:۲۸) ''وہ اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھے''۔ انہوں نے ایک بندۂ مؤمن کی حیثیت سے فرعون کے سامنے آنے کا فیصلہ اُس وقت اچانک کیا جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف انتہائی قدم

اٹھانے کا اعلان کیا: ﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی﴾ (المؤمن:۲۶) یعنی جب فرعون نے اہلِ دربار کے سامنے اپنے اس ارادے کا اظہار کیا کہ اس نے موسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو اُس وقت اللہ کے اس بندے نے فرعون کے سامنے کلمۂ حق کہنے کا فیصلہ کرتے ہوئے ایسی زوردار اور مؤثر تقریر کی جس نے پورے دربار کا رنگ بدل کے رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بندے کے اس عمل کی ایسی قدر افزائی فرمائی کہ وہ پوری تقریر قرآن مجید میں نقل فرما دی۔ اس تقریر کا ایک اعزاز یہ بھی ہے کہ یہ قرآن میں نقل ہونے والی کسی انسان کی طویل ترین تقریر ہے—— آیت زیر مطالعہ میں جس بندۂ مؤمن کا ذکر ہوا ہے وہ بھی شاید اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا۔ لیکن اسے جونہی اطلاع ملی کہ اس کی قوم کے لوگ رسولوں کو قتل کرنے جا رہے ہیں تو وہ بھاگم بھاگ وہاں پہنچا اور انہیں خبردار کیا کہ اے میری قوم کے لوگو! ان رسولوں کا اتباع اختیار کرلو فائدے میں رہو گے! یہاں ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ دین و شریعت کی عملی تشکیل اتباعِ رسول سے ہی ممکن ہے۔ یعنی شریعت کے زیر سایہ اصول و ضوابط اور قواعد و قوانین کا جو ڈھانچہ ترتیب پاتا ہے اور تہذیب و تمدن کے جو خدوخال وضع ہوتے ہیں ان کے لیے عملی راہنمائی اتباعِ رسول سے ہی میسر آتی ہے۔

آیت ۲۱ ﴿اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''ان کی پیروی کرو جو تم سے کچھ اجر نہیں مانگتے اور وہ خود ہدایت یافتہ ہیں۔''

''مَنْ لَّا یَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا'' کے الفاظ میں یہاں انبیاء و رسل علیہم السلام کی شخصیات کی اُس امتیازی صفت کا بیان ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ ظاہر ہے انبیاء و رسلؑ کی شخصیات دنیوی اغراض و مفادات کی آلائشوں سے بہت بالا ہوتی ہیں۔ وہ دعوتِ دین کے حوالے سے اپنی محنت اور تگ و دو کے عوض کسی اجر کے خواہاں نہیں ہوتے اور نہ ہی انہیں کسی سے کوئی ذاتی منفعت مطلوب ہوتی ہے۔ ﴿وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''اور وہ خود بھی ہدایت یافتہ ہیں''۔ ان کی زندگیاں روشنی کے مینار اور ان کے اخلاق و کردار منبع ہدایت ہیں۔ ان کی سیرتوں کے فانوس سے اخلاقِ حسنہ اور اعمالِ صالحہ کا نور چھلکا پڑتا ہے۔

آیت ۲۲ ﴿وَمَا لِیَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۲﴾﴾ ''اور مجھے کیا ہے کہ میں اُس کی بندگی نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا اور تمہیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے!''

یہ تبلیغ و نصیحت کا نہایت بلیغ اسلوب ہے۔ وہ بندۂ خدا اپنی قوم کے لوگوں سے یوں بھی مخاطب ہو سکتا تھا کہ تم لوگ اس کفر و شرک کے نتیجے میں برباد ہو جاؤ گے! اپنے کرتوتوں کے سبب تم سب جہنم کا ایندھن بنو گے! اُس وقت تمہارے یہ جھوٹے معبود بھی تمہارے کام نہیں آ سکیں گے! وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ لٹھ مار انداز اپنانے کے بجائے اس نے انہیں مخاطب کر کے اپنے بارے میں بات کی۔

آیت ۲۳، ۲۴ ﴿ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ﴿۲۳﴾ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾﴾ ''کیا میں اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو معبود بنا لوں؟ اگر رحمٰن مجھے کوئی تکلیف دینا چاہے تو ان کی سفارش میرے کسی کام نہ آئے گی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکیں گے۔ (اگر میں یہ روش اختیار کروں گا) تو پھر میں یقیناً ایک کھلی گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا۔''

یہ تمام باتیں درحقیقت اس بندۂ مؤمن کے مخاطبین پر صادق آتی تھیں۔ اسے تو اللہ تعالیٰ پہلے ہی ہدایت سے نواز چکا تھا اور نعمتِ ہدایت کے باعث وہ جھوٹے معبودوں سے پہلے ہی لاتعلق ہو چکا تھا۔ مگر اس نے نہایت دلنشیں پیرائے میں ان کے غلط عقائد و نظریات کو اپنی ذات کے حوالے سے بے نقاب کیا۔ دعوت و تبلیغ کے لیے یہ دھیما اور متواضع انداز اس قدر ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون جیسے شخص سے بات کرنے کے لیے بھی یہی انداز اپنانے کی ہدایت کی کہ فرعون بے شک بغاوت اور سرکشی پر آمادہ ہے: ﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا﴾ (طٰہٰ: ۴۴) ''لیکن تم دونوں اس کے ساتھ نرمی سے بات کرنا۔''

اگلی آیت میں اس بندۂ خدا کے فیصلہ کن الفاظ نقل ہوئے ہیں:

آیت ۲۵ ﴿اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾﴾ ''میں بلاشبہ تمہارے رب پر ایمان لے آیا ہوں، تم لوگ میری بات توجہ سے سنو!''

یہ ہے اُس شخص کی جرأتِ رندانہ کا کلائمکس! وہ شخص دیکھ رہا تھا کہ پوری قوم رسولوں کے خلاف آخری اور فیصلہ کن اقدام کرنے کے لیے ایکا کر چکی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس صورت حال میں ان کے حق میں بات کرنا گویا پوری قوم سے دشمنی مول لینے کے مترادف ہے۔ اس کے باوجود اس نے اس انتہائی نازک موقع پر اعلائے کلمۃ الحق کا فرض ادا کیا، بلکہ بھرے مجمع

میں انتہائی واشگاف الفاظ میں یہ اعلان بھی کر دیا: ﴿اِنِّیۡۤ اٰمَنۡتُ بِرَبِّکُمۡ فَاسۡمَعُوۡنِ ﴿۲۵﴾﴾ کہ تم لوگ کان کھول کر سن لو! میں تمہارے رب پر ایمان لا چکا ہوں! میں ان رسولوں کو سچا مانتا ہوں! میں ان کی تصدیق کرتا ہوں! میں ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کا عزم کیے ہوئے ہوں! اس بندۂ خدا کی زندگی کا وہ لمحہ دراصل جرأتِ ایمانی کے برملا اظہار کا تقاضا کرتا تھا۔ اس نے اس لمحے کی نزاکت کو بروقت پہچانا اور اس کا حق ادا کر دیا۔ لیکن اس کا نتیجہ وہی نکلا جو ایسی جرأتِ رندانہ اور ایسے نعرۂ مستانہ کا عام طور پر نکلا کرتا ہے —— یعنی اس کی قوم کے بپھرے ہوئے لوگوں نے اسے موقع پر ہی شہید کر دیا۔

آیت ۲۶، ۲۷ ﴿قِیۡلَ ادۡخُلِ الۡجَنَّۃَ ؕ قَالَ یٰلَیۡتَ قَوۡمِیۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِیۡ رَبِّیۡ وَ جَعَلَنِیۡ مِنَ الۡمُکۡرَمِیۡنَ ﴿۲۷﴾﴾ ''حکم ہوا داخل ہو جاؤ جنت میں! اُس نے کہا: کاش میری قوم کو معلوم ہو جاتا وہ جو میرے رب نے میری مغفرت فرمائی ہے اور مجھے عزت والے لوگوں میں شامل کر لیا ہے۔''

﴿قِیۡلَ ادۡخُلِ الۡجَنَّۃَ ؕ﴾ ''اسے کہہ دیا گیا کہ تم داخل ہو جاؤ جنت میں'' —— زیادہ تر مفسّرین کا اس آیت کے اس مفہوم پر اجماع ہے کہ اس بندۂ مؤمن کی مذکورہ تقریر کے بعد اس کی قوم کے لوگوں نے اسے فوری طور پر شہید کر دیا اور یہ کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی شہادت کے بعد دیا گیا۔ سورۃ الفجر کی درج ذیل آیات میں بھی اللہ تعالیٰ کے ایک ایسے ہی قابل رشک حکم کا ذکر آیا ہے:

﴿یٰۤاَیَّتُہَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّۃُ ﴿۲۷﴾ ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً ﴿۲۸﴾ فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ ﴿۲۹﴾ وَ ادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ ﴿۳۰﴾﴾

''اے اطمینان پانے والی روح! اپنے رب کی طرف لوٹ چل تو اُس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ تو میرے (نیک) بندوں میں شامل ہو جا۔ اور میری جنت میں داخل ہو جا!''

آیات زیر مطالعہ پر غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ تینوں رسول متعلقہ قوم کے افراد نہیں تھے، بلکہ کسی دوسرے علاقے سے اس قوم کی طرف بھیجے گئے تھے۔ آیت ۱۴ کے الفاظ ﴿اِذۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَیۡہِمُ اثۡنَیۡنِ فَکَذَّبُوۡہُمَا فَعَزَّزۡنَا بِثَالِثٍ﴾ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ اس حوالے سے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اپنی رسالت کا اظہار تو بہت

بھرپور انداز میں کیا' لیکن ان کی گفتگو میں کہیں یٰقَوْمَنَا کے الفاظ استعمال نہیں ہوئے۔ جبکہ ان کی نصرت کے لیے آنے والے بندۂ مؤمن نے ان لوگوں کو "اے میری قوم" کے الفاظ سے مخاطب کیا: ﴿یٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۲۰﴾﴾ کہ اے میری قوم کے لوگو! تم ان رسولوں کی پیروی کرو!

اس ضمن میں اگرچہ اللہ تعالیٰ کا عام قاعدہ تو یہی رہا ہے کہ کسی قوم کی طرف مبعوث ہونے والا رسول اسی قوم کا فرد ہوتا تھا' لیکن اس قاعدے میں کہیں کہیں استثناء کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ جیسے حضرت لوط علیہ السلام کو جس قوم کی طرف مبعوث کیا گیا آپؑ اس قوم کے فرد نہیں تھے۔ آپؑ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے اور حضرت ابراہیمؑ ہی کے ساتھ عراق سے ہجرت کر کے شام کے علاقے میں آئے تھے۔ وہاں سے آپؑ کو سدوم اور عامورہ کی بستیوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔ اسی طرح حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا: ﴿اِذْهَبَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ﴿۴۳﴾﴾ (طٰہٰ)۔ حالانکہ آپ حضرات کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا' فرعون کی قوم سے نہیں تھا۔ یہاں پر ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی "رسالت" کا رخ فرعون کی طرف تھا' جبکہ بنی اسرائیل کے لیے آپؑ کی حیثیت ایک "نبی" کی تھی۔

بہرحال اس بندۂ مؤمن کی تقریر کے بعد ان لوگوں نے رسولوں سے تو صرفِ نظر کر لیا' لیکن ان سے یہ برداشت نہ ہو سکا کہ ان کی قوم میں سے کوئی شخص ان اجنبی افراد کی حمایت میں بات کرے جو ان کے معبودوں کے درپے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اسے موقع پر ہی شہید کر دیا۔ شہادت کے بعد جب اسے جنت میں داخلے کی نوید سنائی گئی تو اسے بے اختیار اپنی قوم کے لوگ یاد آ گئے: ﴿قَالَ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُکْرَمِیْنَ ﴿۲۷﴾﴾ اس نے جنت میں داخل ہوتے ہوئے بڑی حسرت سے کہا کہ کاش میری قوم کے لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ نے میری تمام خطاؤں کو معاف کر کے مجھے بخش دیا ہے اور میرے ساتھ بہت عزت و اکرام کا معاملہ فرمایا ہے۔ یعنی اگر میری قوم کے لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ میں حق پر تھا تو شاید وہ بھی ایمان لے آتے۔ گویا کہ اپنے قتل کے بعد بھی اس بندۂ مؤمن کے دل میں اپنی قوم کے لوگوں کے ساتھ خیر خواہی' وفاداری اور محبت کا جذبہ بدستور موجود تھا۔ خود حضور ﷺ بھی اپنی قوم کے لوگوں کے بے حد خیر خواہ تھے' بلکہ اپنی قوم کے ساتھ خیر خواہی کا یہ

جذبہ تو آپؐ کے قلبِ مبارک کا بوجھ بنا ہوا تھا۔ مشرکین میں سے اکثر لوگ حضور ﷺ کے عزیز واقارب تھے جو بغیر سوچے سمجھے عذابِ الٰہی کی طرف دوڑے چلے جا رہے تھے۔ آپؐ ان کی طرف سے اکثر متفکر اور پریشان رہتے تھے کہ اگر انہوں نے اپنی روش تبدیل نہ کی تو یہ سب کے سب جہنم کی آگ میں جھونک دیے جائیں گے۔ آپ ﷺ کی اس پریشانی کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً سورۃ الشعراء میں آپ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝۳﴾ ''(اے نبی ﷺ!) اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو اس غم میں شاید آپ اپنے آپ کو ہلاک ہی کر ڈالیں گے۔''

آیت ۲۸ ﴿وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ۝۲۸﴾ ''اس کے بعد ہم نے اس کی قوم پر آسمان سے کوئی لشکر نہیں اُتارا اور نہ ہی ہمیں کوئی لشکر اتارنے کی حاجت تھی۔''

آیت کے الفاظ اور اسلوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بندۂ مؤمن کی شہادت کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ نے اس قوم کے سب لوگوں کو ہلاک کر دیا اور انہیں رسولوں کے خلاف عملی طور پر اقدام کرنے کی مہلت نہ ملی۔ ظاہر ہے جب اللہ تعالیٰ کلمہ ''کُن'' کہہ کر اس قوم کے تمام افراد کو ہلاک کر سکتا تھا تو ان کے خلاف اسے آسمانوں سے لشکر اتارنے کی کیا ضرورت تھی۔ واضح رہے کہ یہاں یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بیان کے لیے آئے ہیں' ان الفاظ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے لشکر اتارے جانے کی نفی نہیں ہوتی۔ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہیں اہلِ ایمان کی تائید و نصرت کے لیے فرشتوں کے لشکر اتار دیں۔ جیسے کہ غزوۂ بدر میں فرشتوں کے لشکر اتارے گئے تھے۔ کسی شاعر نے اس ضمن میں کیا خوب کہا ہے:۔

فضائے بدر پیدا کر' فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی!

بہر حال اللہ تعالیٰ اپنی مشیت اور حکمت کے تحت کئی کاموں کو اپنی مخلوق میں سے کچھ افراد کے ذمہ لگا دیتا ہے' ورنہ وہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ہے۔ وہ جو چاہے' جس طرح چاہے' ہر کام براہِ راست خود بھی کر سکتا ہے' اسے کسی کام کے لیے فرشتے بھیجنے یا کسی اور واسطے کی احتیاج نہیں۔ یہاں ﴿وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ۝۲۸﴾ کے الفاظ میں دراصل اللہ تعالیٰ کی اسی قدرت کا بیان ہے۔

رسول مغلوب نہیں ہوتے!

یہاں پر میں یہ نکتہ خصوصی طور پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اس واقعہ میں جن صاحب کی شہادت کا ذکر ہے وہ رسول نہیں تھے' جبکہ رسولوں کے خلاف ان لوگوں کو کسی قسم کا اقدام کرنے کی مہلت نہیں دی گئی تھی۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ رسولوں کو قتل یا مغلوب نہیں کیا جا سکتا (البتہ انبیاء کا معاملہ الگ ہے)۔ اس حوالے سے سورۃ الصافات کی یہ آیات بہت واضح ہیں: ﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٧١﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿١٧٢﴾ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿١٧٣﴾﴾ ''اور ہمارے بندے جو رسول ہیں ان کے حق میں پہلے ہی حکم صادر ہو چکا ہے' کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے گی' اور یقیناً ہمارا لشکر ہی غالب رہے گا''۔ قرآن مجید میں زمانہ ماضی کی اقوام کے انجام سے متعلق جتنے واقعات بیان ہوئے ہیں' ان سب سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جب کسی رسول کے دشمن ان پر غلبہ حاصل کرنے کے قریب ہوتے تو وہ اللہ کو مدد کے لیے پکارتے۔ جیسے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے مشکل وقت میں اللہ تعالیٰ کو پکارا تھا: ﴿اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴿١٠﴾﴾ (القمر) کہ اے پروردگار! اب میں مغلوب ہوا جاتا ہوں' پس تو میرا بدلہ لے! ایسے نازک موقع پر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی مدد پہنچ جاتی۔ سرکش اور نافرمان لوگوں کو ہلاک کر دیا جاتا اور رسول کو اہل ایمان ساتھیوں سمیت بچا لیا جاتا۔ چنانچہ مذکورہ بستی کے لوگوں نے اپنی قوم کے ایک فرد کو تو قتل کر دیا' لیکن اس سے پہلے کہ وہ رسولوں پر ہاتھ ڈالتے اللہ تعالیٰ نے انہیں ختم کر کے رکھ دیا۔

آیت ۲۹ ﴿اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ﴿٢٩﴾﴾ ''وہ تو صرف ایک چنگھاڑ تھی' سو وہ (اس سے) ناگہاں بجھ کر رہ گئے۔''

یہاں لفظ خٰمِدُوْنَ اپنے مفہوم (بھڑکتی ہوئی آگ کے دفعتاً بجھ جانے) کے اعتبار سے اپنے اندر آگ کے ایک ایسے الاؤ کا نقشہ سمیٹے ہوئے ہے جو چند لمحے پہلے تو بہت جوش و خروش سے بھڑک رہا تھا' مگر پھر یک لخت راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ گویا وہ لوگ جو چند لمحے پہلے غصے' تکبر اور سرکشی کے باعث آپے سے باہر ہو رہے تھے عذابِ الٰہی کی ایک ہی چنگھاڑ کی تاب نہ لاتے ہوئے پلک جھپکنے کی دیر میں نیست و نابود ہو کر رہ گئے۔ ان لوگوں کے

عبرتناک انجام کا یہ نقشہ اس سورت کے نزول کے وقت خصوصی طور پر مشرکین مکہ کو دکھانا مقصود تھا' جیسا کہ اس رکوع کی پہلی آیت (۱۳) کے الفاظ ﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ﴾ سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اس واقعہ کے حوالے سے دراصل ابوجہل' ولید بن مغیرہ اور عُتبہ بن ابی مُعیط جیسے سردارانِ قریش کو خبردار کرنا مقصود تھا کہ اس وقت بے شک تمہاری گردنیں بہت اکڑی ہوئی ہیں۔ آج تمہیں اپنی دولت' سیادت اور چودھراہٹ کے بل پر طرح طرح کی سرمستیاں اور گستاخیاں سوجھ رہی ہیں۔ مگر یاد رکھو! اللہ کی مشیت کے سامنے تمہاری ساری شوخیاں اور منصوبہ بندیاں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ اور ہمارے رسول (ﷺ) کے خلاف تمہاری کوئی چال بھی کامیاب نہیں ہو سکے گی۔

آیت ۳۰ ﴿يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۳۰﴾ ''حسرت ہے بندوں پر' کہ ان کے پاس جو بھی رسول آیا وہ اس کا مذاق ہی اڑاتے رہے۔''

قوموں کا حسرتناک طرزِ عمل

﴿يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ﴾ ''حسرت ہے بندوں پر''۔ واضح رہے کہ حسرت ایک انفعالی کیفیت ہے جس کا تعلق ہم انسانوں سے ہے' اللہ تعالیٰ کی ذات سے نہیں۔ اس حوالے سے یہاں یہ نکتہ ذہن نشین کر لیجیے کہ قرآن مجید میں کہیں کہیں رنج' غم' حسرت' افسوس جیسی انفعالی کیفیات اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ ایسی آیات کو پڑھتے ہوئے یہ حقیقت ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی انفعالی کیفیات سے بہت بلند ہے۔ کسی انفعالی کیفیت سے اثر قبول کرنا اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہم انسانوں کو سمجھانے کے لیے ایسی کیفیات کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

﴿مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۳۰﴾ کسی قوم کے پاس جب بھی کوئی رسول آیا تو اس قوم کے لوگوں نے اس کے ساتھ ہنسی مذاق ہی کا رویہ روا رکھا۔ بجائے اس کے کہ وہ رسولوں کی بات پر سنجیدگی سے غور کرتے' ان کی دعوت کے لیے اپنے دل و دماغ کے دروازے کھولتے' انہوں نے ان کی دعوت کو استہزاء اور تمسخر میں ہی اڑانے کی کوشش کی۔

آیت ۳۱ ﴿اَلَمْ یَرَوْا کَمْ اَهْلَکْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَیْهِمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۳۱﴾﴾

''کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ کتنی قومیں ہم ان سے پہلے ہلاک کر چکے ہیں' جواب کبھی بھی ان کے پاس لوٹ کر نہیں آئیں گی!''

کیا قریش مکہ کو معلوم نہیں کہ ان سے پہلے جن قوموں نے اپنے رسولوں کے ساتھ ایسا غیر سنجیدہ رویہ اختیار کیا تھا انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ یہ لوگ قومِ عاد' قومِ ثمود' قومِ شعیب اور قومِ لوطؑ کے علاقوں تک سے واقف ہیں اور ان کے انجام سے بھی بخوبی آگاہ ہیں۔ اس کے باوجود ابوجہل اور اس کے ساتھی ان ہی قوموں کی روش پر چلتے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ کے خلاف فیصلہ کن اقدام کرنے کی قراردادیں پاس کر رہے ہیں۔ گویا آج مکہ میں تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرانے جا رہی ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کو مذکورہ اقوام کی تاریخ کے آئینے میں اپنا انجام دیکھ لینا چاہیے۔

﴿اَنَّهُمْ اِلَیْهِمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۳۱﴾﴾ یعنی وہ قومیں ایسے تباہ ہوئیں کہ پھر دوبارہ دُنیا میں لوٹ کر نہ آ سکیں۔ البتہ نسلِ انسانی کی تاریخ میں بعض ایسی اقوام کی مثالیں بھی ملتی ہیں جن پر عروج و زوال کے کئی ادوار آئے۔ مثلاً بنی اسرائیل دو مرتبہ شدید زوال کا شکار ہوئے اور دونوں مرتبہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عروج بخشا۔ ایسا ہی معاملہ مسلمانوں کے ساتھ بھی ہوا۔ بنی اسرائیل کے پہلے زوال کے بعد انہیں ملنے والے عروج کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل میں اس طرح آیا ہے: ﴿ثُمَّ رَدَدْنَا لَکُمُ الْکَرَّةَ عَلَیْهِمْ وَاَمْدَدْنٰکُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ وَجَعَلْنٰکُمْ اَکْثَرَ نَفِیْرًا ﴿۶﴾﴾ ''پھر ہم نے ان (فاتحین) پر تمہیں غلبہ دیا اور مال اور اولاد سے تمہاری مدد کی اور نفری میں تمہیں بہت زیادہ بڑھا دیا''۔ دورِ حاضر میں اب یہودی تیسری مرتبہ عروج حاصل کرتے نظر آ رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے یہ مقام اپنے بل بوتے پر نہیں بلکہ دوسروں کی نظرِ کرم کی وجہ سے حاصل کیا ہے۔ ان کے حوالے سے یہ صورت حال سورۂ آل عمران کی آیت ۱۱۲ کے الفاظ ﴿اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ﴾ کی عملی تفسیر ہے۔ بہرحال آیت زیرِ مطالعہ میں خصوصی طور پر قومِ نوحؑ' قومِ عاد' قومِ ثمود' قومِ شعیبؑ اور قومِ لوطؑ کی طرف اشارہ ہے جو ایسی برباد ہوئیں کہ پھر دوبارہ نہ اُٹھ سکیں۔ آج ان کی داستانِ عبرت سنانے کے لیے صرف قوم ثمود کے دیار و مساکن کے کھنڈرات باقی ہیں۔

آیت ۳۲ ﴿وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۲﴾﴾ ''اور یقیناً یہ سب لوگ (ایک دن) ہمارے حضور حاضر کیے جائیں گے۔''

یہاں پر اِنْ دراصل اِنَّ کا مخفف ہے اور ''یقیناً'' کے معنی میں آیا ہے۔ یعنی وہ تمام لوگ جو اپنے اپنے دور میں اللہ کے رسولوں سے اعراض و انکار کے سبب عذاب کا شکار ہوئے' قیامت کے دن یقیناً ایک مرتبہ پھر زندہ کر کے اللہ کے حضور حاضر کر دیے جائیں گے اور پھر ان کے لیے اُخروی عذاب کا فیصلہ ہوگا۔ جیسا کہ سورۃ التغابن میں فرمایا گیا: ﴿اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۡ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۵﴾﴾ ''کیا تمہیں ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جنہوں نے اس سے پہلے کفر کیا تھا' تو انہوں نے (دنیا میں) اپنے کام کا بدلہ چکھ لیا اور ان کے لیے (آخرت میں) المناک عذاب ہے''۔ یعنی اپنے کفر و انکار کی ایک سزا تو انہیں عذابِ ہلاکت کی شکل میں دنیا کے اندر ہی مل گئی تھی' لیکن اس کے علاوہ دردناک اُخروی عذاب ابھی ان کا منتظر ہے۔

اس رکوع میں ایک ایسا واقعہ بیان ہوا ہے جو تمام رسولوں کے ساتھ تقریباً ایک ہی انداز میں پیش آتا رہا ہے۔ یعنی رسولوں کی دعوت کے جواب میں قوم کا اعراض و انکار اور استہزاء و تمسخر..... رسولوں کی بشریت کو ان کی رسالت کے خلاف دلیل بنانا..... اس موقف پر اَڑ جانا کہ تم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی چیز نازل نہیں کی گئی اور تمہارا رسول ہونے کا دعویٰ جھوٹا ہے اور پھر..... رسولوں کے خلاف فیصلہ کن اقدام کا ارادہ کرنا..... اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی نصرت کا ظہور ہونا..... منکرین کا ہلاک ہو جانا..... اور رسولوں کو ان کے اہل ایمان ساتھیوں سمیت بچا لیا جانا۔ یہ ہیں اس داستانِ عبرت کے چند اہم عنوانات جسے یہاں بستی اور رسولوں کا نام لیے بغیر بیان کیا گیا ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ یہ ان حالات کا ایک اجمالی خاکہ ہے جن کا سامنا ہر رسول کو ہر دور میں کرنا پڑا۔ اور اس خاکے کو یہاں اس انداز میں پیش کرنے کا مقصد شاید یہ ہے کہ ہر پڑھنے سننے والا اپنے ذوق و تحقیق کے مطابق اس میں جیسا رنگ بھرنا چاہے بھر لے۔

اس خاکے کے آئینے میں ایک طرف قریش کو ان کے انجام کا نقشہ دکھا دیا گیا اور دوسری طرف نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں کی دلجوئی کے لیے اس وعدۂ ربانی کو مؤکد کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت آ کر رہے گی۔ واقعہ کے بین السطور میں حضور ﷺ اور اہل ایمان کو جو

پیغام دیا گیا ہے وہ بہت واضح ہے کہ وقتی طور پر بلاشبہ حالات کے تیور سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ مٹھی بھر اہلِ ایمان کو بڑی آسانی سے ختم کر دیا جائے گا اور خود اللہ کے رسول ﷺ کے خلاف بھی فیصلہ کن اقدام ہو کر رہے گا۔ زمینی حقائق کے درمیان سے بظاہر کامیابی کا کوئی راستہ نکلتا نظر نہیں آتا' لیکن تم لوگوں کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کامیابی کا راستہ ضرور نکالے گا۔ اللہ کا کلمہ ہر صورت میں بلند ہوگا اور اس کے دشمن خائب و خاسر ہو کر رہیں گے۔

مذکورہ بستی اور رسولوں کا تعیّن

اب رہا یہ سوال کہ یہ کس بستی کا ذکر ہے اور اس بستی میں مبعوث ہونے والے تین رسول کون تھے؟ اس بارے میں ابن کثیرؒ اور امام رازیؒ سمیت تمام متقدمین ایک ہی روایت بیان کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر مفسّرین اس روایت پر تنقید بھی کرتے نظر آتے ہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے علاوہ کوئی دوسری روایت کسی کو ملی ہی نہیں۔ یہ روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول پر مبنی ہے۔ بہرحال اگر تو یہ حدیث مرفوع ہوتی یعنی اس میں سند کے ساتھ حضور ﷺ کا فرمان نقل کیا گیا ہوتا تو ہمارے لیے اس کا ماننا لازمی تھا' لیکن آثارِ صحابہؓ کی صحت کا فیصلہ تو اصولِ درایت کی بنیاد پر ہی ہوگا۔ یعنی اگر تو یہ اثر قرین قیاس حقائق پر مبنی ہوگا تو تسلیم کیا جائے گا' بصورت دیگر اس کا قبول کیا جانا ہمارے لیے لازمی نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اس قول کا خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بستی سے مراد انطاکیہ کا قدیم شہر ہے اور یہاں جن تین رسولوں کا ذکر ہوا ہے وہ اللہ کے رسول نہیں تھے' بلکہ اللہ کے رسول (حضرت مسیح علیہ السلام) کے رسول تھے۔ یعنی حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے دو حواریوں کو تبلیغ کے لیے انطاکیہ بھیجا تھا۔ جب ان کی دعوت غیر مؤثر ہوگئی تو آپؑ نے اپنے ایک بہت ہی قریبی ساتھی حضرت شمعون کو ان کی مدد کے لیے بھیجا۔ چنانچہ ان تین افراد کی کوششوں اور اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے اس شہر کے کچھ لوگ ایمان لے آئے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اس قول پر متقدمین اور متاخرین کی طرف سے درج ذیل اعتراضات بھی اٹھائے گئے ہیں:

(i) تاریخ میں انطاکیہ شہر پر ایسے کسی عذاب کا ذکر نہیں ملتا جس میں اس شہر کے بیشتر باشندے ہلاک ہوگئے ہوں۔

(ii) اس کے برعکس تاریخی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواری جب تبلیغ

کے لیے اس علاقے میں آئے تو سب سے پہلے انطاکیہ کے باشندوں نے ہی ان کی دعوت کو قبول کیا' جس کی وجہ سے یہ شہر بعد میں مسیحیت کا بہت بڑا مرکز بنا۔

(iii) تاریخ انسانی میں ایسی کوئی نظیر نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو کہ اللہ کے رسولوں کے بھیجے ہوئے نمائندوں کی دعوت سے اعراض کے نتیجے میں بھی کسی قوم پر عذاب آیا ہو۔

یہ اعتراضات اپنی جگہ بہت ٹھوس اور معقول ہیں۔ دوسری طرف تقریباً تمام متقدمین کا اجماع ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کے علاوہ اس بارے میں کوئی دوسری روایت موجود نہیں۔ اس پس منظر میں اکثر مفسرین کی رائے یہی ہے کہ جب قرآن نے بستی اور رسولوں کا تعین نہیں کیا تو ہمیں اس بارے میں خواہ مخواہ تجسس نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ دورِ حاضر کے مفسرین میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ کا خیال ہے کہ یہاں پر القریۃ چونکہ اسم معرفہ کے طور پر آیا ہے اس لیے متعلقہ شہر کا تعین ضروری ہے۔ چنانچہ ان کی رائے کے مطابق یہاں القریۃ (بستی) سے مراد مصر ہے اور دو رسولوں سے مراد حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام ہیں' جبکہ اس حوالے سے تیسری شخصیت جس کا ذکر یہاں فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ کے الفاظ میں آیا ہے وہ مؤمنِ آلِ فرعون ہیں' جنہوں نے فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حمایت میں تقریر کی تھی۔ وہ اگرچہ رسول نہیں تھے لیکن یہ کہ بر سبیلِ تغلیب دو رسولوں کے ساتھ ان کا ذکر بھی بطور رسول ہی آ گیا ہے —— میں نے ذاتی طور پر مولانا اصلاحی صاحب کی اس رائے پر بہت کھلے اور غیر جانبدارانہ ذہن کے ساتھ غور کیا ہے' لیکن درج ذیل نکات پر میرا دل مطمئن نہیں ہوا:

(i) اس واقعہ میں تیسرے رسول (فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ) اور شہر کے پرلے سرے سے آنے والا شخص (جَاءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى) واضح طور پر دو الگ الگ کردار نظر آتے ہیں' جبکہ مولانا اصلاحی کے نزدیک ان دونوں آیات میں ایک ہی شخصیت' یعنی مؤمنِ آلِ فرعون کا ذکر ہوا ہے۔

(ii) سورۃ المؤمن میں مؤمن آلِ فرعون کی تقریر اور اس تقریر پر فرعون کے ردعمل کے حوالے سے جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون اس مدلّل اور بے باک تقریر کے سامنے لاجواب ہو چکا تھا۔ اپنے موقف کے دفاع میں انتہائی معذرت خواہانہ

انداز میں وہ صرف یہی کہہ سکا تھا: ﴿مَا اُرِیۡکُمۡ اِلَّا مَاۤ اَرٰی﴾ (المؤمن:۲۹) کہ میں نے تو آپ لوگوں کے سامنے وہی رائے پیش کی ہے جو مجھے درست معلوم ہوتی ہے' باقی آپ جانیں اور آپ کا معاملہ۔ فرعون کے اس تبصرے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس تقریر کے بعد دربار کا رنگ بالکل ہی بدل گیا تھا اور وہ اس بندۂ مؤمن کے خلاف کسی قسم کا کوئی اقدام کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ جبکہ زیر مطالعہ آیات کے مطالعہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ رسولوں کی حمایت میں بولنے والے بندۂ مؤمن کو اس کی قوم کے لوگوں نے موقع پر ہی شہید کر دیا تھا۔

اس ضمن میں مجھے ذاتی طور پر ان مفسرین سے اتفاق ہے جن کا خیال ہے کہ یہاں بستی اور رسولوں کے تعین کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہوسکتا ہے یہ حضرت نوح علیہ السلام سے بھی پہلے کے زمانے کا واقعہ ہو۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو محض ایک مثال کے طور پر یہاں بیان کیا ہے اور اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ماضی میں اللہ کے رسولوں کو ان کی قوموں کی طرف سے کیسے حالات کا سامنا کرنا پڑتا رہا ہے اور بالآخر اس کا کیا نتیجہ نکلتا رہا ہے۔ اس واقعہ میں ایک طرف کفارِ مکّہ کے لیے بہت واضح وعید اور تنبیہ ہے' اور دوسری طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ ایمان ساتھیوں کے لیے تسلی اور دلجوئی کا پیغام ہے۔

رکوع ۳

وَاٰیَۃٌ لَّہُمُ الۡاَرۡضُ الۡمَیۡتَۃُ ۚ اَحۡیَیۡنٰہَا وَاَخۡرَجۡنَا مِنۡہَا حَبًّا فَمِنۡہُ یَاۡکُلُوۡنَ ﴿۳۳﴾
وَجَعَلۡنَا فِیۡہَا جَنّٰتٍ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ وَّفَجَّرۡنَا فِیۡہَا مِنَ الۡعُیُوۡنِ ۙ﴿۳۴﴾
لِیَاۡکُلُوۡا مِنۡ ثَمَرِہٖ ۙ وَمَا عَمِلَتۡہُ اَیۡدِیۡہِمۡ ؕ اَفَلَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۳۵﴾ سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ
خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ کُلَّہَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَمِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ وَمِمَّا لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۶﴾
وَاٰیَۃٌ لَّہُمُ الَّیۡلُ ۚ نَسۡلَخُ مِنۡہُ النَّہَارَ فَاِذَا ہُمۡ مُّظۡلِمُوۡنَ ﴿۳۷﴾ ۙ وَالشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ
لِمُسۡتَقَرٍّ لَّہَا ؕ ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ﴿۳۸﴾ وَالۡقَمَرَ قَدَّرۡنٰہُ مَنَازِلَ حَتّٰی
عَادَ کَالۡعُرۡجُوۡنِ الۡقَدِیۡمِ ﴿۳۹﴾ لَا الشَّمۡسُ یَنۡۢبَغِیۡ لَہَاۤ اَنۡ تُدۡرِکَ الۡقَمَرَ وَلَا
الَّیۡلُ سَابِقُ النَّہَارِ ؕ وَکُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ ﴿۴۰﴾ وَاٰیَۃٌ لَّہُمۡ اَنَّا حَمَلۡنَا ذُرِّیَّتَہُمۡ

فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿٤١﴾ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿٤٢﴾ وَاِنْ نَّشَاْ
نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴿٤٣﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰى
حِيْنٍ ﴿٤٤﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ
تُرْحَمُوْنَ ﴿٤٥﴾ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿٤٦﴾
وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا
اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٤٧﴾ وَيَقُوْلُوْنَ
مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٤٨﴾ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً
تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ﴿٤٩﴾ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ
يَرْجِعُوْنَ ﴿٥٠﴾

سورۂ یٰسٓ کا قلب

نبی اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق سورۂ یٰسٓ قرآن حکیم کا قلب ہے۔ جبکہ اس رکوع کے مضامین پر غور کرنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس سورت کا قلب یہ تیسرا رکوع ہے۔ اگرچہ ترتیب کے اعتبار سے بھی یہ رکوع اس سورت کے قلب (درمیان) میں واقع ہے، لیکن اسے سورت کا ''قلب'' میں نے اس کے مضامین کی مناسبت سے قرار دیا ہے۔ قبل ازیں تمہیدی کلمات میں اس سورت کے مضامین اور مکی سورتوں کے درمیان اس کے محل وقوع (location) کے حوالے سے تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اس سورت کا تعلق مکی سورتوں کے چھ گروپس میں سے درمیانی دو گروپس سے ہے۔ ان دو گروپس کی اکیس سورتوں میں سے دس سورتیں ایک طرف ہیں، دس دوسری طرف اور ان کے عین وسط میں سورۂ یٰسٓ ہے۔ ان اکیس سورتوں کا مرکزی مضمون ''توحید'' ہے۔ پہلے دو گروپس کی سورتوں کا مرکزی مضمون ''رسالت'' جبکہ آخری دو گروپس میں شامل سورتوں کا مرکزی مضمون ''آخرت'' ہے۔ ویسے تو یہ تینوں مضامین تقریباً تمام طویل مکی سورتوں میں آئے ہیں، لیکن ہر گروپ کی سورتوں میں ان میں سے کسی ایک مضمون کو عمود اور مرکز و محور کی حیثیت حاصل ہے۔ بہرحال مکی سورتوں کے ان چھ گروپس میں مضامین کی جو تقسیم اور ترتیب پائی جاتی ہے اس کا عکس بعینہٖ ہمیں سورۂ یٰسٓ کے اندر بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً اس کے پہلے دو رکوعوں میں رسالت کے مضمون پر زور

ہے۔ آخری دو رکوعوں کا مرکزی مضمون آخرت ہے' جبکہ تیسرے اور وسطی رکوع کا مرکزی مضمون توحید ہے۔ توحید چونکہ دین کا اصل الاصول ہے' اس لیے میں نے اس رکوع کو اس سورت کا قلب قرار دیا ہے۔

آیت: ذریعۂ تذکیر

اس رکوع کا آغاز وَاٰيَةٌ لَّهُمُ کے الفاظ سے ہوتا ہے اور یہ الفاظ اس رکوع میں تین مرتبہ آئے ہیں:

﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ﴾ ''اور ان کے لیے ایک نشانی ہے مردہ زمین''

﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۚ﴾ ''اور ان کے لیے ایک نشانی ہے رات''

﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿٤١﴾﴾ ''اور ان کے لیے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو ایک بھری ہوئی کشتی میں سوار کر دیا۔''

لفظ ''آیت'' کے لغوی معنی نشانی کے ہیں' اور نشانی کسی ایسی چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی دوسری چیز کی یاد تازہ کر دے۔ مثلاً آپ کے پاس آپ کے کسی دوست کا دیا ہوا کوئی تحفہ تھا جو بہت مدت تک آپ کی نظروں سے اوجھل رہا۔ اس دوران میں اس دوست کی یاد بھی آپ کے حافظے سے محو ہو گئی۔ پھر ایک دن اچانک آپ کی نظر اس تحفے پر پڑی تو اسے دیکھتے ہی متعلقہ دوست کی یاد بھی آپ کے حافظے میں تازہ ہو گئی۔ کائنات کی ہر چیز اسی مفہوم میں اللہ تعالیٰ کی نشانی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ہر نشانی اللہ تعالیٰ کے وجود پر' اس کی توحید پر' اس کی حکمتِ بالغہ پر' اس کی صفات کے کمال پر' اس کے عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر اور بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْم ہونے پر ہر اُس انسان کے لیے ایک دلیل قطعی کی حیثیت رکھتی ہے جس کی فطرت سلیم اور عقل پختہ ہو۔ اسی لیے قرآن مجید اثباتِ ذاتِ باری تعالیٰ کے لیے ہر باشعور انسان کو دعوتِ فکر دیتا ہے کہ وہ شش جہات پھیلی اس کائنات کا مشاہدہ کرے' آسمان کی سرگوشیوں کو سنے' پہاڑوں کی فلک بوس چوٹیوں کے اشاروں کو سمجھے اور ان تخلیقات میں پائے جانے والے عجائبات کے حوالے سے ان کے خالق کو پہچانے:

﴿اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿١٧﴾ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿١٨﴾ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿١٩﴾ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ

سُطِحَتْ ﴿۲۰﴾ (الغاشیة)

''کیا وہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح پیدا کیا گیا ہے؟ اور آسمان کی طرف' کہ وہ کیسے بلند کیا گیا ہے؟ اور پہاڑوں کی طرف' کہ وہ کیسے نصب کیے گئے ہیں؟ اور زمین کی طرف' کہ وہ کیسے بچھائی گئی ہے؟''

مشاہدۂ کائنات کے لیے قرآن مجید کے اس خوبصورت اور پُرتاثیر اندازِ ترغیب کی جھلک ہمیں علامہ اقبال کے ہاں بھی ملتی ہے:۔

کھول آنکھ' زمیں دیکھ' فلک دیکھ' فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

واضح رہے کہ قرآن مجید کائنات میں ہر طرف پھیلی ہوئی اللہ کی نشانیوں کو دیکھنے اور ان پر غور وخوض کرنے کی صرف ترغیب دیتا ہے۔ ان سے نتائج اخذ کر کے لوگوں کے سامنے نہیں رکھتا کہ ''عاقلاں را اشارہ کافی است''۔ جس نے واقعتاً سبق حاصل کرنا ہوگا اس کے لیے اشارہ ہی کافی ہے' لیکن جو کوئی انکار پر ادھار کھائے بیٹھا ہو تو اسے کوئی بڑی سے بڑی دلیل بھی قائل نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے اثبات کے حوالے سے قرآن مجید کا یہ طرزِ استدلال ایک طرح سے منطقی استدلال ہی ہے۔ منطق کی دراصل دو اقسام ہیں' یعنی استخراجی منطق (deductive logic) اور استقرائی منطق (inductive logic)۔ استخراجی منطق کے تحت صرف دستیاب معلومات سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ اس فلسفے کو ارسطو نے متعارف کرایا تھا۔ اس کے مقابلے میں قرآن نے استقرائی فلسفہ متعارف کرایا اور انسان کو مشاہدے اور تجربے کی مدد سے علم حاصل کرنے کی راہ دکھائی۔

مشاہدۂ کائنات کی ترغیب کا مقصد دراصل انسان کی یاددہانی ہے جس کے لیے قرآن مجید میں ''تذکیر'' اور ''تذکر'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ گویا ایک انسان کو اللہ تعالیٰ کے عرفان کی تعلیم کی ضرورت نہیں' تذکیر کی ضرورت ہے۔ تعلیم کا تعلق کوئی نئی چیز سیکھنے سکھانے سے ہے' جبکہ تذکیر کے معنی کسی کو کوئی بھولی ہوئی بات یاد دلانے کے ہیں۔ اس لحاظ سے قرآن کی تذکیر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا عرفان انسان کی فطرت میں پہلے سے موجود ہے' اللہ تعالیٰ کے وجود کی شہادت اس کی روح کی گہرائیوں (تحت الشعور) میں پہلے سے مضمر ہے۔ اس یاد یا اس گواہی کو اس کی یادداشت کے ذخیرے کی گہرائیوں سے نکال کر شعور کی سطح پر

لانے کی ضرورت ہے۔ اسی لیے سورۃ الغاشیہ کی مذکورہ بالا آیات (آیات ۱۷ تا ۲۰) میں اللہ تعالیٰ نے اپنی چند نشانیوں کا پے در پے ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ﴿فَذَكِّرْ ۖ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾﴾ کہ اے نبی (ﷺ) آپؐ یاددہانی کراتے رہیے' آپؐ کی ذمہ داری فقط یاددہانی کی حد تک ہی ہے۔ اسی طرح سورۂ عبس میں فرمایا: ﴿كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿١١﴾ فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ ﴿١٢﴾﴾ کہ یہ قرآن مجید تو ایک یاددہانی ہے' تو جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرلے۔ یہ ہے اثباتِ ذاتِ باری تعالیٰ کے ضمن میں قرآن مجید کا طرزِ استدلال۔ اس طرزِ استدلال میں ''آیت'' اور ''تذکیر'' کے الفاظ بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔

تذکّر کا منطقی تقاضا: تشکّر

اللہ تعالیٰ کو اپنے خالق کے طور پر پہچاننے کے بعد ایک صاحبِ شعور انسان کے لیے اگلا لازمی اور منطقی تقاضا یہ ہے کہ وہ اسے ''منعمِ حقیقی'' کے طور پر بھی پہچانے۔ اس کے لیے اس رکوع میں جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ ''شکر'' ہے۔ جذبۂ شکر بھی انسان کی فطرت کے اندر پیدائشی طور پر موجود ہے۔ اگر انسان کی فطرت سلیم ہو تو اس کے دل میں اپنے محسن کے لیے جذباتِ تشکر لازماً پیدا ہوتے ہیں۔ ہاں اگر کسی کی فطرت ہی مسخ ہوگئی ہو تو دوسری بات ہے — بہرحال عقل انسانی جذبۂ شکر کی بنیاد پر اپنے اصل منعم اور محسنِ حقیقی کو خوب پہچانتی ہے۔ ایک باشعور اور فطرتِ سلیم کے حامل انسان پر یہ حقیقت بہت جلد عیاں ہو جاتی ہے کہ —— اس دنیا میں رہتے ہوئے اس کی ضرورت کی تمام اشیاء جن جن راستوں سے ہو کر' جو جو ذرائع اپنا کر اس تک پہنچ رہی ہیں وہ سب راستے اور وہ تمام ذرائع ایک ہی نظام کا حصہ ہیں۔ یہ پوری کائنات پر محیط ایک ''وحدانی نظام'' ہے' جس کا ہر پرزہ دوسرے پرزے کے ساتھ مل کر کام کر رہا ہے۔ اس عظیم الشان نظام کی باگ ڈور جس ناظم اور مدبر کے ہاتھ میں ہے وہ علیم اور حکیم ہستی ہے۔ اُسی نے اس نظام کو بنایا ہے اور وہی اسے چلا رہا ہے —— یہاں پہنچ کر ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان اللہ تعالیٰ کو اپنے محسن حقیقی کے طور پر پہچان لیتا ہے اور اس کا جذبۂ شکر اللہ تعالیٰ کی ذات سے متعلق ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ''شکر'' ہمارے دین کے فلسفے کی جڑ اور بنیاد ہے اور اسی سے جذبۂ عبادت جنم لیتا ہے۔

فطری طور پر انسان اپنے محسن کے احسان کا بدلہ احسان کی صورت میں چکانا چاہتا ہے۔

انسانوں میں کسی انسان کے سب سے بڑے محسن اس کے والدین سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ عام طور پر ایک انسان اپنے والدین کے حقوق کا خیال رکھ کر' بڑھاپے میں ان کی خدمت کر کے اور ان کے لیے دعا کر کے ـــــ ﴿رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿٢٤﴾﴾ (بنی اسرائیل) ـــــ کسی نہ کسی درجے میں ان کے احسان کا بھی جواب دینے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کوئی انسان اللہ تعالیٰ کے احسانات کا بدلہ کیسے چکائے؟ اس نکتے کو اس مثال سے سمجھئے کہ کچھ لوگ سورج کو اپنا رب مانتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سورج ان کا بہت بڑا محسن ہے۔ اس لیے کہ وہ دنیا کو روشنی اور حرارت مہیا کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے موسم بدلتے ہیں' فصلیں پکتی ہیں' اسی کی وجہ سے ہوائیں چلتی ہیں' بادل بنتے ہیں اور بارشیں برستی ہیں۔ غرض اس کی وجہ سے ان کی زندگی کی ساری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ سورج کو اپنا محسن اور ربّ سمجھتے ہوئے اس کے احسانات کا بدلہ چکانا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کے لیے مشکل یہ ہے کہ وہ بدلے میں سورج کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے اور کسی سطح پر بھی اس کے احسانات کا بدلہ نہیں چکا سکتے۔ اس لیے وہ اپنے جذبۂ تشکّر کے اظہار کے لیے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ گویا جب انسان کا محسن اس کی اپنی سطح سے بہت بلند ہو تو ایسی فوق الادراک یا فوق البشر ہستی کے معاملے میں اس کا جذبۂ تشکّر عبادت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لہٰذا جب کوئی انسان اللہ تعالیٰ کو اپنے محسن کے طور پر پہچان لیتا ہے اور اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ سورج' چاند' ستارے' بادل' ہوائیں' موسم سب اسی کے حکم کے تابع ہیں' فاعل حقیقی اور مؤثر حقیقی صرف اور صرف اُسی کی ذات ہے تو بے اختیار اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے لیے جذبۂ تشکر موجزن ہو جاتا ہے۔ اس جذبے کے تحت وہ اپنے محسن کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہے' مگر اللہ تعالیٰ تو اس کی سطح سے بہت بلند ہے' اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں' اسے کوئی احتیاج نہیں' وہ ہر طرح سے بے نیاز ہستی ہے۔ اس کا فرمان ہے: ﴿مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ﴿٥٧﴾﴾ (الذّٰریٰت) کہ میں انسانوں سے کسی چیز کا طلب گار نہیں ہوں اور نہ ہی میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کچھ کھلائیں پلائیں۔ اللہ تعالیٰ اس سے ماورا ہے کہ اسے کسی چیز کی احتیاج ہو۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُوا الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿٥٨﴾﴾ (الذّٰریٰت) ''اللہ تعالیٰ تو خود (سب کا) رازق ہے' وہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔''

ایسی صورت حال میں انسان صرف یہی کر سکتا ہے کہ وہ جذبہ تشکر سے مغلوب ہو کر اپنے محسن حقیقی اور اپنے رب کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر اُس کی حمد و ثنا کے ترانے گائے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (الفاتحہ) کہ تمام شکر اور تمام ثناء اس اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے — گویا یہ اللہ تعالیٰ کے لیے انسان کا ''جذبۂ شکر'' ہی ہے جس نے آگے بڑھ کر ''جذبۂ عبادت'' کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اثباتِ ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں متکلمین حضرات کے منطقی دلائل اپنی جگہ' لیکن اس حوالے سے قرآن مجید کا طرزِ استدلال بہت سادہ اور عام فہم ہے۔ چنانچہ قرآنی طرزِ استدلال کی مدد سے ایمان باللہ کی دعوت کے پورے فلسفے کو صرف چار الفاظ کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یعنی آیت (نشانی) سے ذکر (یاد دہانی)' ذکر کے نتیجے میں شکر اور پھر عبادت۔ یہ ہے ہمارے دین کا بنیادی فلسفہ اور یہی اس رکوع کا مرکزی مضمون ہے۔

آیت ۳۳ ﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ۝﴾ ''اور ان لوگوں کے لیے مردہ زمین (بھی) ایک بڑی نشانی ہے۔ ہم نے اسے زندہ کیا اور اس سے اناج نکالا جس میں سے وہ کھاتے ہیں۔''

مُردہ زمین کی حیاتِ نو

یہاں دوسرے رکوع کی آخری آیت (گزشتہ آیت) کو ایک مرتبہ پھر دہرا لیجیے: ﴿وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ۝﴾ ''اور یہ سب کے سب (ایک دن) ہمارے سامنے حاضر کر دیے جائیں گے''۔ یعنی گزشتہ آیت میں بعث بعد الموت کا ذکر ہے اور اسی ربط میں زیر مطالعہ آیت میں اس نشانی کا ذکر آیا ہے جس کا تعلق براہِ راست بعث بعد الموت سے ہے۔ اس آیت میں اٰيَةٌ کا لفظ بطور اسم نکرہ آیا ہے اور عربی زبان میں اسم نکرہ کا استعمال کسی چیز کی تفخیم (بڑائی ظاہر کرنے) کے لیے بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا اسم نکرہ کی وجہ سے ﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ﴾ کا درست ترجمہ یوں ہوگا کہ ان لوگوں کے لیے مردہ زمین ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ ﴿اَحْيَيْنٰهَا﴾ ''ہم اسے زندہ کرتے ہیں'' یعنی وہ زمین جو سوکھے کے موسم میں بالکل مردہ پڑی ہوتی ہے' روئیدگی وغیرہ کی صورت میں اس کے اندر زندگی کے کوئی آثار نظر

نہیں آتے، بارش کے برستے ہی اس میں بقول جگر مراد آبادی ''زندگی ہی زندگی''☆ موجزن نظر آنے لگتی ہے۔

اس مضمون کی وضاحت کے لیے سورۃ الحج کی اس آیت میں بہت خوبصورت الفاظ آئے ہیں: ﴿وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ⑤﴾ (الحج) ''اور تم دیکھتے ہو کہ زمین خشک پڑی ہوتی ہے، پھر جب ہم نے اس پر مینہ برسایا تو وہ حرکت میں آئی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی پر بہار چیزیں اُگانا شروع کر دیں''۔ لفظ اِهْتــــزاز میں حرکت کے معنی پائے جاتے ہیں۔ یہ لفظ سورۃ القصص کی آیت ۳۱ میں سانپ کے حرکت میں آنے کے مفہوم میں آیا ہے: ﴿فَلَمَّا رَآهَا تَهْتَزُّ كَأَنَّهَا جَانٌّ﴾ ''تو جب موسیٰ نے دیکھا کہ وہ حرکت کر رہا ہے جیسے کوئی اژدہا ہو۔''

آیت زیر مطالعہ کا مضمون قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ مختلف پودوں اور جڑی بوٹیوں کے بیج خشک زمین کے اندر خوابید (dormant) حالت میں پڑے رہتے ہیں، مگر جونہی اس زمین پر بارش برستی ہے تو فوری طور پر اس میں osmosis کا عمل شروع ہو جاتا اور جگہ جگہ نباتات کی کونپلیں زندگی کی شہادت دیتی ہوئی برآمد ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس عمل کا مشاہدہ روئے زمین پر ہر علاقے کے لوگ اپنی روزمرہ زندگی میں آئے روز کرتے ہیں۔ ان کے اسی تجربے کی بنیاد پر قرآن نے انہیں یاد دلایا: ﴿كَذَٰلِكَ الْخُرُوجُ ⑪﴾ (ق) کہ زمین سے تمہارا خروج بھی بالکل اسی طرح ہوگا۔ یعنی اس مثال کو سامنے رکھ کر تم سمجھ لو کہ نباتات کے بیجوں کی طرح تمہارے اجسام کے اجزائی ذرات بھی زمین کے اندر مدتوں محفوظ رہیں گے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا تو ان ''بیجوں'' میں زندگی کے آثار نمایاں ہو جائیں گے اور تم سب کے سب زندہ ہو کر نباتات کی کونپلوں کی طرح زمین سے باہر نکل آؤ گے۔ واضح رہے کہ قرآن کی اس دلیل کا تعلق منطق (logical argument) سے نہیں، بلکہ اس کی بنیاد انسان کے مشاہدے پر ہے۔ اس لحاظ سے اسے استقرائی منطق (inductive logic) قرار دیا جا سکتا ہے۔ اصل میں یہ انسان کے باطن میں سوئے ہوئے

☆ جگر مراد آبادی نے شراب سے تائب ہو کر جو ساقی نامہ لکھا تھا اس کا ایک شعر یوں ہے:

رگوں میں بھی کبھی صہبا ہی صہبا رقص کرتی تھی　　مگر اب زندگی ہی زندگی ہے موجزن ساقی!

شعور کو جگانے کا ایک انداز ہے۔ اب اس کے بعد کلام کا رخ جذبہ تشکر کی طرف موڑا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ ایمان باللہ کے لیے اصل استدلال وہ جذبہ شکر ہے جو فطرت انسانی کے اندر مضمر ہے۔

﴿وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ﴿٣٣﴾﴾ ''ہم نے اس زمین میں سے غلّہ نکالا جس میں سے یہ کھاتے ہیں''۔ غلّے سے انسانوں کی غذا بنتی ہے اور ان کی بہت سی دوسری ضروریات بھی اس سے پوری ہوتی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

آیت ۳۴ ﴿وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴿٣٤﴾﴾ ''اور ہم نے بنا دیے ہیں اس میں باغات کھجوروں کے بھی اور انگوروں کے بھی' اور اس میں ہم نے چشمے بھی جاری کر دیے ہیں۔''

آیت ۳۵ ﴿لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٣٥﴾﴾ ''تاکہ وہ کھائیں اس کے پھلوں میں سے' اور ان کو نہیں بنایا ان کے ہاتھوں نے۔ تو کیا یہ شکر نہیں کرتے؟''

ربوبیتِ الٰہی کے آثار و مظاہر

اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے یہ سارے آثار و مظاہر ان کے سامنے ہیں۔ ان کی احتیاجات کو پورا کرنے کا ایک مکمل نظام اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے۔ ان کی غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے غلے کے علاوہ اس نے طرح طرح کے پھل بھی پیدا کیے ہیں: ﴿وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ۭ﴾ ''اور یہ تمام چیزیں ان کے ہاتھوں کی کاریگری کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوئیں۔ علامہ اقبال کی نظم ''اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ'' (بالِ جبریل) کے درج ذیل اشعار گویا ان الفاظ (وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ) ہی کی تفسیر ہیں:

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ — کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ — خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ — موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں' تیری نہیں — تیرے آباء کی نہیں' تیری نہیں' میری نہیں!

دنیا کے بیشتر کام بظاہر ہم انسانوں کے ہاتھوں ہوتے نظر آتے ہیں' لیکن اس حوالے

سے اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سلسلۂ اسباب میں انسان کا عمل دخل ایک فیصد بھی نہیں ہے۔ شعبہ زراعت ہی کی مثال لے لیجیے۔ کسان جتنی چاہے محنت کر لے اور جو وسائل چاہے بروئے کار لے آئے' لیکن اگر مطلوبہ فصل کے اگنے سے لے کر اناج کی برداشت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے سازگار موسم کو یقینی نہ بنایا جائے تو اس کے سارے منصوبے اور اندازے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ اسی طرح قدرت کی طرف سے فراہم کیے گئے پانی کے ذخائر میں سے اگر کوئی ذخیرہ روئے زمین پر موجود ''زندگی'' کی پہنچ سے دور ہو جائے تو انسانی کوششیں کسی طرح بھی اس کی تلافی نہیں کر سکتیں۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ۝۳۰﴾ (الملك) ''کہو! کیا تم نے کبھی سوچا کہ اگر تمہارا پانی زمین کی تہ میں اتر جائے تو کون ہے جو لائے تمہارے لیے میٹھا صاف پانی؟''

آیت زیر مطالعہ کے جملے ﴿وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ﴾ کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس میں مَا 'نافیہ' نہیں بلکہ ''موصولہ'' ہے' یعنی یہاں ''مَا'' نفی کے معنی کے بجائے ''جو'' کے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ اس رائے کے مطابق ﴿لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ﴾ کا مفہوم یوں ہوگا ''تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ثمرات سے بھی کھائیں اور ان سے بھی جو وہ خود محنت سے پیدا کرتے ہیں''۔ گویا یہ وہی مضمون ہے جو سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں بیان ہوا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۣ﴾ ''اے ایمان والو! خرچ کرو پاکیزہ چیزیں اس میں سے جو تم نے کمایا اور اس میں سے جو کچھ ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا''۔ یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت کے مطابق اسے وَمِمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْهِمْ پڑھا جاتا ہے۔ چنانچہ اس قراءت کے لحاظ سے آیت کا ترجمہ یوں ہوں گا: ''تاکہ وہ کھائیں اس کے پھلوں میں سے اور اس میں سے بھی جو کچھ ان کے ہاتھوں کی کمائی ہے۔''

انعاماتِ الٰہیہ کا نتیجہ: جذبۂ شکر

اب اگلے فقرے میں وہ سوال پوچھا جا رہا ہے جس کا تعلق اس آیت کے اصل پیغام سے ہے کہ جب ان کی ساری غذائی ضروریات اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ پھلوں' غلوں وغیرہ سے پوری ہو رہی ہیں تو کیا وہ اس کے بدلے میں اپنے رازق اور محسن کی نعمتوں کا اعتراف بھی

کرتے ہیں یا نہیں؟ ﴿اَفَلَا یَشْکُرُوْنَ ﴿۳۵﴾﴾ ''تو کیا وہ شکر نہیں کرتے؟'' اس سوال کا رخ دراصل ہر اُس شخص کی طرف ہے جس کے اندر کا انسان زندہ ہے اور جس کے اندر تذکر پذیری اور عبرت آموزی کا مادہ موجود ہے۔ ظاہر ہے اس خطاب کا مخاطب وہ بے حس انسان نہیں ہو سکتا جس کی فطرت میں شکر کے سوتے خشک ہو چکے ہوں' اور جو اپنی زندگی میں انواع و اقسام کی نعمتوں سے مسلسل لطف اندوز ہونے کے باوجود کبھی یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہ کرے کہ اس کے لیے یہ خوانِ نعمت بچھانے والا اس کا اصل منعم و محسن کون ہے۔ چنانچہ ایک سلیم العقل انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ کائنات کی ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کی نشانی کے طور پر دیکھے۔ ان نشانیوں کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے بارے میں ''تذکر'' حاصل کرے اور اس تذکر کے نتیجے میں اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے لیے ''شکر'' کے جذبات جنم لیں۔ یہ مضمون سورۃ الفرقان کی ان آیات میں واضح تر انداز میں آیا ہے:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ﴿۶۱﴾ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾﴾

''بہت بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں رکھ دیا ایک چراغ (سورج) اور ایک روشن چاند۔ اور وہی ہے جس نے دن اور رات کو بنا دیا ہے ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا' اُس کے لیے جو نصیحت حاصل کرنا چاہے یا شکر گزار بننا چاہے۔''

سورۃ الفجر میں ارشاد ہوا: ﴿یَوْمَىٕذٍ یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿۲۳﴾﴾ ''اُس روز انسان کو سمجھ آ جائے گی' لیکن اب سمجھنے کا کیا فائدہ؟'' ظاہر ہے سوچنے سمجھنے کا فائدہ تو تب ہو گا جب انسان اپنی دنیا کی زندگی میں سوچے سمجھے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اس کائنات اور کائنات میں بکھرے ہوئے اللہ تعالیٰ کی صناعی کے نمونوں کو چشم بصیرت سے دیکھے اور اس مشاہدے کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کو اپنے خالق اور محسن کی حیثیت سے پہچانے۔ اس کے نتیجے میں اس کے دل میں اپنے محسن کے لیے جذبہ تشکر پیدا ہو اور یہ جذبہ تشکر آگے بڑھ کر جذبہ عبودیت کی شکل اختیار کرے۔ یہ ہمارے دین کا بنیادی فلسفہ بھی ہے اور انسانی فطرت کی پکار بھی۔

سورۃ الفاتحہ کی پہلی آیت انسانی فطرت کی اسی پکار کو الفاظ و معانی عطا کرتی ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ ''کُل شکر اور کُل ثنا اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔''

آیت ۳۶ ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ ''پاک ہے وہ ذات جس نے پیدا کیا ہے تمام جوڑوں کو' اُس میں سے بھی جو زمین اُگاتی ہے' اور خود ان کی اپنی جانوں سے بھی' اور اُس میں سے بھی جس کے بارے میں یہ لوگ نہیں جانتے۔''

تخلیقِ ازواج کی نشانی

لفظ اَزْوَاج یہاں دو معنی دے رہا ہے۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انواع و اقسام کی مخلوقات پیدا کی ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ ان مخلوقات کو اُس نے جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ اندازِ تخلیق اس کے پورے سلسلہ تخلیق میں اصولِ موضوعہ کے طرز پر نظر آتا ہے۔ مثلاً نسلِ انسانی میں قومیتوں' شکلوں' رنگتوں' زبانوں' قد و قامت وغیرہ کے اعتبار سے تنوع کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ دیکھنے کو ملتا ہے جس کا احصاء و شمار ممکن نہیں۔ پھر یہ کہ ان سب کے اپنے اپنے جوڑے ہیں۔ یعنی ہر نسل اور قومیت کے مرد اور عورت میں باہم خاص مناسبت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ: یعنی جو کچھ زمین سے اُگتا ہے اس میں بھی جوڑے پائے جاتے ہیں۔ آج کا انسان تو اس حقیقت سے بہت اچھی طرح آگاہ ہے' لیکن نزولِ قرآن کے زمانے میں نباتات میں پائے جانے والے جوڑوں (نر اور مادہ) کے بارے میں لوگ زیادہ نہیں جانتے تھے۔ البتہ ایک حدیث سے اندازہ ہوتا ہے کہ عرب کے لوگ اس زمانے میں بھی اپنے تجربے کی بنیاد پر کھجور کے درختوں کی ان خصوصیات سے آگاہ تھے اور وہ لوگ بہتر پیداوار کے لیے ''تابیرِ نخل''، یعنی نر پھولوں اور مادہ پھولوں کے مصنوعی ملاپ (artificial polination) کے طریقے سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ [کھجور کے درخت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ درخت عالمِ حیوانات اور عالمِ نباتات کے مابین حد فاصل ہے۔ حیوانات کے اندر پائے جانے والے نر اور مادہ کے اوصاف کھجور کے درختوں میں بہت واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں]۔ حضور ﷺ نے جب مدینہ کے لوگوں کو یہ عمل کرتے دیکھا تو آپؐ کو عجیب لگا۔ ظاہر ہے آپؐ

وَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ (مکہ) کے رہنے والے تھے۔ آپ تجارت کے اسرار و رموز سے تو آگاہ تھے، مگر زراعت کے پیشے سے متعلق آپ کسی عملی تجربے سے نہیں گزرے تھے۔ اس لیے ''تابیرِ نخل'' کا عمل آپ کے لیے بالکل ایک نئی بات تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے بر سبیلِ تذکرہ فرمایا: ((لَوْ لَمْ تَفْعَلُوْا لَصَلَحَ)) کہ اگر تم لوگ یہ کام نہ کرو تو شاید بہتر ہو! حدیث کے الفاظ اور اسلوب سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کا ارادہ یا انداز کوئی خاص حکم دینے کا نہیں تھا۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو ظاہر ہے آپ کے ہر اشارے کو بھی حکم کے درجے میں سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے تجرباتی علم کی منطق کو پس پشت ڈالتے ہوئے ''تابیرِ نخل'' کے طریقے پر عمل نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال مدینہ میں کھجور کی پیداوار بہت کم ہوئی۔ صحابہؓ نے جب حضور ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْيَاكُمْ))(۱) کہ تم اپنے دنیوی معاملات کو مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ آپ ﷺ کے اس فرمان سے درس گاہِ نبوتؐ کے نصابِ تعلیم و حکمت سے متعلق ایک انتہائی اہم اصول کی نشاندہی ہوتی ہے۔ گویا اس فرمان کے ذریعے آپ نے واضح فرما دیا کہ آپ لوگوں کو زراعت کے رموز سکھانے یا سائنس کی تعلیم دینے نہیں آئے۔ لوگ اپنے دنیوی معاملات کو اپنے تجربات کی روشنی میں نپٹایا کریں۔ جبکہ آپ ﷺ لوگوں کو اخلاق کی تعلیم دینے اور انہیں اللہ سے جوڑنے کے لیے آئے ہیں، تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ان الفاظ کی روشنی میں آپ کی امت کے لوگ اپنا رُخ درست کر کے اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو سکیں:

﴿اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۷۹﴾ (الانعام)

''میں نے یکسو ہو کر اپنا رُخ اس ہستی کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔''

بہرحال آج ہم جانتے ہیں کہ نباتات کے اندر جوڑوں کا بہت محکم نظام پایا جاتا ہے۔ بعض نباتات میں نر اور مادہ پھول الگ الگ ہوتے ہیں، جبکہ بعض پودوں میں ایک ہی پھول کے اندر نر اور مادہ حصے پائے جاتے ہیں۔

---

(۱) صحیح مسلم، ح: ۲۳۶۳۔ مسند احمد، ح: ۲۴۹۶۴۔ راوی: عائشة رضی اللہ عنها وانس بن مالك رضی اللہ عنه۔

وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں (انسانوں کو) بھی جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا ہے۔ یہ مضمون سورۃ النساء کی ابتدائی آیت میں زیادہ واضح انداز میں آیا ہے۔ حضور ﷺ یہ آیت خطبہ نکاح کے آغاز میں تلاوت فرمایا کرتے تھے: ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً ۚ﴾ ''اے انسانو! تقویٰ اختیار کرو اپنے رب کا' جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی میں سے اس کا جوڑا پیدا کیا' اور پھیلائے ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں۔''

﴿وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۳۶﴾ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اور بھی بہت سی چیزوں کو جوڑوں کی شکل میں پیدا فرمایا ہے جن کے بارے میں ابھی تم لوگ نہیں جانتے ہو۔ اس فقرے کے مخاطب اوّل تو ظاہر ہے نزولِ قرآن کے زمانے کے لوگ تھے' لیکن انسانی علم چونکہ محدود ہے' اس لیے یہ فقرہ گویا تا قیامِ قیامت ہر زمانے کے لوگوں کے لیے ہے۔ اس لیے کہ ہر زمانے کے لوگ بہت سی چیزوں کے بارے میں لاعلم ہوتے ہیں۔ مثلاً کچھ عرصہ پہلے تک انسان ''ایٹم'' کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ علامہ اقبال نے تو خداداد بصیرت کی بنیاد پر شاعرانہ انداز میں کہہ دیا تھا: ''لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں''۔ لیکن جب واقعی ذرّے کا دل چیرا گیا (یعنی جب ایٹم کا تجزیہ کیا گیا) تو اس میں سے جہاں حرارت و توانائی کے عظیم الشان منبع کی دریافت کی شکل میں خورشید کا لہو ٹپکا' وہاں اس تجزیے سے یہ حیران کن انکشاف بھی ہوا کہ ایک ذرے کے اندر بھی پروٹان اور الیکٹران کے مثبت اور منفی چارجز کی شکل میں جوڑے کا نظام کارفرما ہے۔ بہرحال اس آیت سے یہ واضح اشارہ ملتا ہے کہ ازواج (جوڑوں) کی نسبت سے کائنات کی کوئی چیز بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ جیسا کہ سورۃ الذاریات کی اس آیت میں فرمایا گیا: ﴿وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۴۹﴾ ''ہر چیز کو ہم نے جوڑا جوڑا پیدا کیا تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔''

دنیوی زندگی کا جوڑا: اُخروی زندگی

اللہ تعالیٰ کا یہ اصولِ تخلیق ایک طرف تو اس کی خلاقی و صناعی کی نشانیوں میں سے ایک بہت بڑی نشانی ہے اور دوسری طرف اس میں عالمِ آخرت کے وجود کے بارے میں ایک لطیف اشارہ بھی موجود ہے۔ اس اشارے کو ہر باشعور انسان بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے جب ہر چیز کا جوڑا بنایا ہے تو اس دنیا کا بھی تو کوئی جوڑا ہونا چاہیے۔ اور ظاہر ہے دنیا کا جوڑا آخرت ہے۔ اس حوالے سے اس موضوع پر غور کرنے سے ایک باشعور انسان پر یہ حقیقت ریاضی کے کسی فارمولے کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا اور آخرت یا حیاتِ دنیوی اور حیاتِ اخروی مل کر جوڑا بناتی ہیں اور یہ کہ حیاتِ دنیوی کا نظام اس وقت تک ادھورا اور نامکمل ہے جب تک اس کے ساتھ حیاتِ اخروی کو شامل نہ کیا جائے۔ اگر اس حقیقت کو تسلیم نہ کیا جائے تو خیر اور شر کے فرق و امتیاز کا تصور بے معنی ہو کر رہ جائے گا اور اس احمقانہ انگریزی کہاوت کو بھی سچ ماننا پڑے گا کہ:

Nothing is good or bad, only thinking makes it so.

کہ حقیقت میں کوئی چیز اچھی یا بری نہیں ہوتی' یہ دراصل انسان کی سوچ ہے جو کسی چیز کو اچھا یا برا بنا دیتی ہے۔

چنانچہ اگر کوئی باشعور انسان یہ سمجھتا ہے کہ نیکی اور بدی کی اقدار مستقل ہیں اور خارج میں اپنا مستقل وجود رکھتی ہیں' تو اسے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ نیکی کی جزا اور بدی کی سزا بھی انسان کو ضرور ملنی چاہیے۔ پھر اس کے ساتھ اسے اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس دنیا کے اندر کسی انسان کو ''قرار واقعی'' سزا یا جزا کا ملنا کسی طرح بھی ممکن نہیں' اور یہ کہ اس حوالے سے انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اس عالم کے بعد لامحالہ ایک اور عالم کی ضرورت ہے' جہاں انسانوں کو ان کی دنیوی زندگی کے اچھے برے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل سکے۔ گویا کسی باشعور انسان کے لیے یہ حقیقت تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ جس طرح مرد کے بغیر عورت نامکمل ہے اور عورت کے بغیر مرد ادھورا ہے' اسی طرح عالمِ آخرت کے بغیر عالمِ دنیا نامکمل اور ادھورا ہے' اس لیے کہ اس دنیا میں تو ہر طرف اندھیر نگری چوپٹ راج کا نقشہ نظر آتا ہے۔ یہاں تو نیکی کے بدلے میں انسان کو سزا بھی بھگتنا پڑتی ہے' یہاں تو دیانت داری اور راست باز لوگوں کے حصے میں اکثر مصیبتیں اور پریشانیاں آتی ہیں' جبکہ حرام خوری اور ظلم و زیادتی کی روش پر چلنے والے شیطان نما انسان یہاں عیاشیوں اور اللّوں تللّوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ لہٰذا اگر اسی دنیا کو اصل اور مکمل دنیا سمجھ لیا جائے تو یہ ایک ناقص اور نامکمل تخلیق قرار پائے گی۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی کوئی تخلیق ناقص نہیں ہو سکتی۔ بہرحال اس دنیا کے نظام اور اس

کی تخلیق کے اندر اخلاقی اعتبار سے جو خلا نظر آتا ہے‘ وہ خلا صرف ایمان بالآخرت سے ہی پر ہو سکتا ہے۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں: ((اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃِ))[1] کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ دنیا میں انسان جو بوئے گا ''گندم از گندم بروید‘ جو ز جو'' کے مصداق آخرت میں اسے وہی کچھ کاٹنا ہوگا۔ گویا دنیا اور آخرت انسانی زندگی کے دو ابواب ہیں اور ان دونوں ابواب کے ملنے سے ہی کتابِ زندگی تکمیل پذیر ہوتی ہے۔ دنیا اور آخرت کے مابین نسبت زوجیت کے اس فلسفے کو اگر ایک منطقی دلیل کے طور پر پیش کیا جائے‘ تو ممکن ہے کوئی اور منطق اس منطق کو کاٹ دے‘ لیکن اگر انسان اس حقیقت کو کائنات کے اندر کارفرما ایک عمومی ''تخلیقی اصول'' سمجھتے ہوئے اس پر غیر جانبدارانہ غور کرے تو اس سے حاصل ہونے والی نصیحت اس کے دل میں اُتر کر اپنا اثر ضرور دکھائے گی۔

آیت ۳۷ ﴿وَاٰیَۃٌ لَّھُمُ الَّیْلُ ۚ نَسْلَخُ مِنْہُ النَّھَارَ فَاِذَا ھُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾﴾ ''اور ان کے لیے بہت بڑی نشانی ہے رات‘ ہم اس میں سے کھینچ لیتے ہیں دن کو اور پھر وہ تاریکی میں پڑے رہ جاتے ہیں۔''

آیاتِ آفاقیہ

زیر مطالعہ آیات میں آیاتِ آفاقیہ کے حوالے سے جو مضمون بیان ہوا ہے عین وہی مضمون سورۃ الفرقان کی ان آیات میں بھی آیا ہے:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْھَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ﴿۶۱﴾ وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ خِلْفَۃً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾﴾

''بہت بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں رکھ دیا ایک چراغ اور ایک روشن چاند۔ اور وہی ہے جس نے دن اور رات کو بنا دیا ہے ایک دوسرے

---

(۱) تخریج الاحیاء للعراقی: ۲۴/۴۔ قال: لم اجدہ بھذا اللفظ مرفوعًا۔ مُلّا علی قاریؒ نے اس حدیث کو ''موضوعات'' میں ذکر کیا ہے‘ لیکن کہا ہے کہ اس کا معنی ومفہوم درست ہے اور اس آیت قرآنی سے ماخوذ ہے: ﴿مَنْ كَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَۃِ نَزِدْ لَہٗ فِیْ حَرْثِہٖ ۚ﴾ (الشوریٰ: ۲۰)

کے پیچھے آنے والا اُس کے لیے جو نصیحت حاصل کرنا چاہے یا شکر گزار بننا چاہے۔''

یعنی سورج ایک چراغ ہے' جبکہ چاند ایک روشن قندیل۔ سورج کی وجہ سے زمین پر رات اور دن کے الٹ پھیر کا سلسلہ چل رہا ہے جس کے ساتھ کُرّۂ ارض پر ہر قسم کی زندگی کا وجود وابستہ ہے۔ سورج کی اس اہمیت کو نباتاتی حیات کے حوالے سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ دن کے اوقات میں سورج کی روشنی اور تمازت سے نباتات کے لیے photosynthesis کا عمل ممکن ہوتا ہے جو ان کی نشوونما کے لیے ناگزیر ہے۔ سورج کی روشنی فصلوں اور پھلوں کے پکنے کے لیے بھی ضروری ہے۔ جبکہ رات کو نباتات عملِ تنفّس (respiration) کے ذریعے آکسیجن حاصل کرتے ہیں۔ گویا رات اور دن کے الٹ پھیر کے بغیر نباتات کا وجود ممکن ہی نہیں ہے۔ چنانچہ سورج' چاند' رات اور دن پر مشتمل یہ نظام اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی ہے۔

سورۃ الفرقان کی مذکورہ بالا آیات میں بات آسمان کے ذکر سے شروع ہو کر سورج اور چاند سے ہوتی ہوئی نیچے زمین پر رات اور دن تک آئی ہے۔ جبکہ آیات زیر مطالعہ میں پہلے زمین پر اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت (مردہ زمین کے احیاء اور رنگا رنگ کے نباتات اگانے کی قدرت) کا بیان ہے۔ اور پھر رات دن' سورج چاند اور دیگر اجرامِ سماوی کا ذکر ہے۔ یعنی دونوں مقامات پر تقریباً ایک ہی مضمون عکسی ترتیب سے بیان ہوا ہے۔ قرآن مجید کے اسی اسلوب کا ذکر سورۃ الزمر آیت ۲۳ میں ﴿كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ﴾ کے الفاظ میں آیا ہے۔ یعنی اس کتاب میں ایک جیسے مضامین الفاظ' اسلوب اور ترتیب بدل بدل کر بار بار دہرائے جاتے ہیں۔

﴿نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾﴾ ''ہم اس میں سے کھینچ لیتے ہیں دن کو اور پھر وہ تاریکی میں پڑے رہ جاتے ہیں۔''

سَلَخَ کے معنی کسی جانور کی کھال کھینچنے کے ہیں۔ یہاں یہ لفظ رات اور دن کی نسبت کے حوالے سے جس انداز میں آیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دنیا کی ''اصل'' تاریکی یا رات ہے۔ اس تاریکی یا رات کو روشن کرنے کے لیے سورج یا دن کی صورت میں روشنی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ اللہ تعالیٰ رات پر دن (روشنی) کی چادر اوڑھا دیتا ہے تو وہ روشن ہو جاتی ہے اور جب وہ اس چادر کو کھینچ لیتا ہے تو نیچے سے وہی تاریکی اور ظلمت نمودار ہوتی ہے جو اس دنیا

کی ''اصل'' ہے۔ سائنسی نقطہ نظر سے بھی دیکھیں تو حقیقت یہی ہے کہ سورج سے روشنی کی چادر زمین پر پھیلتی ہے تو وہ روشن ہو جاتی ہے اور جب وہ چادر لپٹ جاتی ہے تو زمین اپنی اصل حالت پر آ جاتی ہے۔ اس معاملے میں مزید غور کریں تو معلوم ہوگا کہ عالمِ خلق کی اصل ''ظلمت'' ہے۔ اس میں اگر کہیں ''نورانیت'' نظر آتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے فیضان انوار کی دین ہے۔ اس نکتے کی مزید وضاحت سورۃ الاعراف کی آیت ۱۷۲ کے حوالے سے ایک حدیث میں ملتی ہے۔ اس آیت میں انسانی ارواح کے اس عہد کا ذکر ہے جو روزِ ازل اللہ تعالیٰ نے ان سے لیا تھا۔ ارواح کے اس اجتماع کے حوالے سے حضور ﷺ کا فرمان حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے بایں الفاظ نقل کیا ہے:

((اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ خَلَقَ خَلْقَهٗ فِیْ ظُلْمَةٍ فَاَلْقٰی عَلَیْهِمْ مِنْ نُوْرِهٖ ، فَمَنْ اَصَابَهٗ مِنْ ذٰلِكَ النُّوْرِ اهْتَدٰی وَمَنْ اَخْطَاَهٗ ضَلَّ، فَلِذٰلِكَ اَقُوْلُ جَفَّ الْقَلَمُ عَلٰی عِلْمِ اللّٰهِ))(۱)

''اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو تاریکی میں پیدا کیا' پھر ان پر اپنا نور ڈالا۔ پس جس پر وہ نور پہنچا اُس نے ہدایت پائی اور جس تک نہیں پہنچا وہ گمراہ ہو گیا۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے علم پر قلم خشک ہو گیا۔''

تو جن ارواح پر اللہ کے نور کا پرتو پڑا وہ سعید ارواح ہیں۔ یعنی ان ارواح کو سعادت اللہ تعالیٰ کے نور کے پرتو کے طفیل حاصل ہوئی۔ سورۃ النور کی آیت ۳۵ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ کہ آسمانوں اور زمین کا نور اللہ ہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو پہچانے گا اور اس پر ایمان لائے گا تو تبھی اس کائنات میں روشنی ہو گی اور تبھی اس کے پوشیدہ حقائق اجاگر ہوں گے: ﴿وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴿۴۰﴾﴾ (النور) ''اور جسے اللہ ہی نور عطا نہ کرے اس کے لیے کوئی نور نہیں۔''

آیت زیرِ مطالعہ کے مذکورہ جملے سے واضح ہوتا ہے کہ دن اور رات (نور اور ظلمت) بھی ایک جوڑا ہے اور ان دونوں کے وجود سے نظامِ کائنات کی بے شمار مصلحتیں وابستہ ہیں۔ جیسا

(۱) سنن الترمذی' ابواب الایمان' باب ما جاء فی افتراق هذه الامة' قال ابوعیسیٰ هذا حدیث حسن۔ ومسند احمد' کتاب المکثرین من الصحابة' باب مسند عبداللّٰه بن عمرو بن عاص' ح ۶۵۵۹۔

کہ سورۃ القصص کی آیات ۷۱ اور ۷۲ سے واضح ہوتا ہے کہ نظامِ کائنات کے اندر دن اور رات دونوں ہی اہم اور ناگزیر ہیں۔ اب اگلی آیات میں سورج' چاند اور دیگر اجرامِ سماویہ کا ذکر ہونے جا رہا ہے جن کی گردش کے نتیجے میں زمین پر دن' رات اور دیگر کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔

آیت ۳۸ ﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴿۳۸﴾﴾ ''اور سورج چلتا رہتا ہے اپنے مستقر (مدار) پر۔ یہ تقدیر (منصوبہ بندی) ہے اُس (اللہ) کی جو زبردست ہے سب کچھ جاننے والا ہے۔''

سورج کی گردش اور اس کا مدار

﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ﴾ ''سورج چلتا رہتا ہے اپنے مستقر پر''۔ مستقر کے معنی مستقل اور دائمی ''جائے قرار'' کے ہیں۔ یہاں اس سے سورج کا وہ راستہ یا مدار مراد ہے جو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف معین کر دیا گیا ہے' اور وہ اپنی گردش کے دوران میں اس راستے سے بال برابر بھی اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا۔ اگلے جملے میں اس بارے میں مزید وضاحت فرما دی گئی: ﴿ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴿۳۸﴾﴾ کہ یہ مستقر اس کا اپنا طے کردہ نہیں ہے' بلکہ اس کے لیے یہ راستہ اس ہستی نے طے کر رکھا ہے جو بہت زبردست ہے اور جسے ہر چیز کا علم ہے۔ انسانی معلومات چونکہ تدریجی انداز میں ارتقاء پذیر ہوئی ہیں' اس لیے ایسی آیات کا مفہوم مختلف زمانوں میں مختلف سمجھا گیا۔ ایک وقت وہ تھا جب انسان زمین کو ساکن اور سورج چاند وغیرہ کو متحرک سمجھتا تھا۔ اس زمانے میں ﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا﴾ کا مفہوم ایک عام انسان کے لیے بہت واضح تھا۔ پھر وہ دور آیا جب انسان نے یہ معلوم کر کے گویا بڑا تیر مارا کہ حقیقت میں زمین سورج کے گرد محوِ گردش ہے' جبکہ سورج اپنی جگہ ساکن ہے۔ اس تھیوری کے دور میں قرآن مجید کے اس جملے کا مفہوم سمجھنے سمجھانے کے لیے علمائے تفسیر کو مختلف تاویلوں کا سہارا لینا پڑا۔ لیکن جب کاروانِ علم چند قدم آگے بڑھا تو انسان یہ جان کر حیران رہ گیا کہ یہاں تو ہر چیز ہی گردش میں ہے۔ حتیٰ کہ ایک حقیر ذرّے کے اندر پروٹان اور الیکٹران تک محوِ حرکت ہیں۔ بقولِ اقبالؔ:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں ثبات اِک تغیّر کو ہے زمانے میں

تو اس کائنات میں کسی شے کو سکون و ثبات نہیں' جیسا کہ آگے آیت ۴۰ میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ۝۴۰﴾ کہ ہر شے اپنے اپنے مدار میں تیر رہی ہے۔ اس جملے کے لفظ ''کُلٌّ'' کی حقیقت کا احاطہ کرنا دراصل انسان کے بس کی بات نہیں۔ کائنات کے بارے میں اب تک جو معلومات انسان کے احاطہ علم میں آئی ہیں' ان سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ زمین اور سورج کئی کئی طرح سے محوِ گردش ہیں۔ مثلاً زمین اپنے محور کے گرد لٹو کی طرح بھی گھوم رہی ہے جس سے دن اور رات وجود میں آتے ہیں' اور یہ سورج کے گرد سالانہ ایک چکر بھی مکمل کرتی ہے جس کی وجہ سے موسموں کا تغیّر و تبدّل ممکن ہوتا ہے۔ اسی طریقے سے سورج کی اپنی گردشیں ہیں۔ وہ اپنے محور پر بھی گھوم رہا ہے اور شاید اپنے کنبے (نظامِ شمسی کے تمام سیاروں) سمیت کسی اور ستارے کے گرد بھی چکر لگا رہا ہے۔ اور اگر سورج واقعی اپنے پورے کنبے کے ساتھ کسی اور ستارے کے گرد محوِ گردش ہے تو اس حوالے سے ہماری زمین کی یہ تیسری گردش قرار پائے گی۔ ستاروں اور سیاروں کی ان گردشوں کے علاوہ Nebulae' کہکشاؤں (glaxies) اور نوری سالوں (light years) کے فاصلوں کے بارے میں آج کا ایک باشعور انسان جب سوچتا ہے تو وہ چکرا کے رہ جاتا ہے۔ اور پھر جب اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ سائنسی ترقی کے تمام تر دعووں کے باوجود انسان اب تک اس کائنات کے ایک معمولی سے حصے کے بارے میں بھی پوری طرح نہیں جان پایا اور یہ کہ آج بھی انسان کو کچھ خبر نہیں کہ یہ کائنات کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہوتی ہے' تو بے اختیار اسے خالق کائنات کی عظمت کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑتے ہیں۔

﴿ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ۝۳۸﴾ یہ منصوبہ بندی اس اللہ کی ہے جو العزیز یعنی مختارِ مطلق اور فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (جو چاہے کر گزرنے والا) ہے۔ اس کے اختیارات پر کوئی تحدید (limitation) نہیں ہے۔ اس کی مرضی کے آگے کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ اسے اپنے منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لیے کہیں سے منظوری نہیں لینی پڑتی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ العَلِيْم بھی ہے۔ مطلب یہ کہ اس کے تمام اختیارات اس کے علم کامل کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ ایک طرف اگر اس کے اختیارات مطلق اور لامحدود ہیں تو دوسری طرف اس کا علم اور اس کی حکمت بھی کامل و اکمل ہے۔ لہٰذا اس کے اختیار مطلق کا الل ٹپ (at random) انداز میں استعمال ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

لفظ 'تقدیر' کا معنیٰ و مفہوم

لفظ تقدیر ہمارے ہاں عام طور پر قسمت یا مستقبل کے حالات کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اس لفظ کے لغوی معنی کسی چیز کا اندازہ مقرر کرنے کے ہیں۔ لفظ تقدیر قـــدر سے مشتق ہے اور ''قـدر'' کسی چیز کی قیمت (value) کو کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے ''تقدیر'' کسی چیز کی ''قدر'' کے تعین (evaluation) کو کہا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں جو چیز بھی تخلیق فرمائی ہے اس کی تقدیر بھی مقرر فرمائی ہے۔ یعنی اس نے اپنی ہر مخلوق کے ہر فرد کی صلاحیتیں بھی طے کر دیں ہیں اور اس کی صلاحیتوں کی حدود (limitations) کا تعین بھی کر دیا ہے۔ مثلاً انسان ہوا میں اڑنے سے قاصر ہے' جبکہ اس کے مقابلے میں ایک چھوٹا سا پرندہ آسانی سے ہوا میں اڑتا پھرتا ہے۔ گویا انسان کی اڑنے سے معذوری اس کی تقدیر کا حصہ ہے اور اس ضمن میں پرندے کی یہ صلاحیت اس کی تقدیر کا ایک پہلو ہے۔ گویا ہر چیز کی تقدیر کا تعلق براہِ راست اس کی تخلیق کے ساتھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ الاعلیٰ میں تقدیر کا ذکر تخلیق کے ذکر کے فوراً بعد آیا ہے:

﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝١ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝٢ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝٣﴾

''تم تسبیح کرو اپنے رب کے نام کی جو سب سے بلند ہے۔ جس نے پیدا کیا' پھر تناسب قائم کیا۔ اور جس نے تقدیر بنائی' پھر ہدایت دی۔''

آیت ۳۹ ﴿وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝٣٩﴾ ''اور ہم نے چاند کے لیے منزلیں مقرر کر دی ہیں' یہاں تک کہ وہ (ان سے گزرتا ہوا) پھر کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔''

﴿وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ﴾ ''اور ہم نے چاند کے لیے منزلیں طے کر دی ہیں''۔ نوٹ کیجیے! یہاں چاند کی منازل کے ضمن میں بھی لفظ قدر (قَدَّرْنَا) آیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے چاند کی ''تقدیر'' بھی طے فرما دی ہے۔ اس کی تقدیر کے مطابق اس کی ۲۸ منزلیں معیّن کر دی گئی ہیں۔ انہی منزلوں میں محوِ سفر رہتے ہوئے وہ گھٹتا بڑھتا نظر آتا ہے۔ ﴿حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝٣٩﴾ یہاں تک کہ وہ ایسی کیفیت کی طرف لوٹ آتا ہے جیسے کھجور کی خم زدہ سوکھی شاخ

ہوتی ہے۔ عُرْجُوْن کھجور کی اس ٹہنی کو کہتے ہیں جو خوشوں کے بوجھ کی وجہ سے جھک جاتی ہے اور پھر سوکھنے پر مستقل طور پر خم زدہ ہو جاتی ہے۔ گویا پہلے دن کا چاند (ہلال) کھجور کی خم زدہ خشک شاخ جیسا نظر آتا ہے۔

آیت ۴۰ ﴿لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝۴۰﴾ ''نہ تو سورج کے بس میں ہے کہ جا پکڑے چاند کو اور نہ رات سبقت لے جا سکتی ہے دن پر' اور سب کے سب اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں۔''

﴿لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ﴾ ''نہ سورج کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے''۔ نوٹ کیجیے! یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ چاند کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ سورج کو جا پکڑے۔ اس لیے کہ چاند چھوٹا ہے' جبکہ اس کے مقابلے میں سورج بہت بڑا ہے۔ لیکن اس کے باوجود سورج کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ چاند کو پکڑ لے اور اس کی گردش کو اپنے تابع کر لے۔ گویا یہ اللہ تعالیٰ کی معین کردہ تقدیر ہے جو سورج کے اوپر غالب ہے اور اسی کی مشیت و مرضی ہے جو چاند کو چلا رہی ہے۔ چنانچہ اللہ کے طے کردہ نظم و ضبط (تقدیر) کے باعث تمام اجرام سماویہ اپنے اپنے مداروں میں محوِ گردش ہیں۔ ان میں سے کوئی کسی دوسرے کی گردش میں خلل اندازی نہیں کر سکتا۔

﴿وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ﴾ ''اور نہ ہی رات کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ دن کی پکڑ سے نکل جائے''۔ یہاں لفظ ''سبقت'' کے معنی کسی کے کسی کی گرفت سے آزاد ہونے کے ہیں۔ سورۃ العنکبوت کی اس آیت (آیت ۴) میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے: ﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ﴾ ''کیا ان لوگوں نے جو برائیاں (اہلِ ایمان پر ظلم و ستم) کر رہے ہیں' یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ ہماری پکڑ سے بچ نکلیں گے!'' گویا اللہ تعالیٰ کے طے کردہ ڈسپلن کے باعث رات کے لیے ممکن نہیں کہ وہ دن کی پکڑ سے نکل جائے۔ اس لیے جب دن آتا ہے تو رات کو اس کے سامنے سرنگوں ہونا پڑتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے یہاں بھی اللہ تعالیٰ کی معین کردہ تقدیر کی پابندی کے ضمن میں دن کے بجائے رات کا ذکر اس لیے آیا ہے کہ دنیا پر دن کے مقابلے میں رات کا وجود مستقل ہے۔ رات اس زمین پر مستقلاً چھائی ہوئی ہے' جبکہ اس کے اوپر دن کی چادر عارضی طور پر بچھائی جاتی ہے (یہ مضمون قبل ازیں آیت ۳۷ کی تشریح کے ضمن

میں تفصیلاً بیان ہو چکا ہے)۔یعنی رات کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے وقتی طور پر دن کا غلبہ قبول کرنا پڑتا ہے۔

﴿وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝۴۰﴾ ''اور ہر شے اپنے اپنے مدار میں تیر رہی ہے''۔اس جملے کے لفظ ''كُلٌّ'' کا مفہوم جس شان کے ساتھ اُجاگر ہو کر موجودہ دور میں انسان کی سمجھ میں آ رہا ہے' نزولِ قرآن کے زمانے میں اس کی اس سطح کی تفہیم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ (مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو آیت ۳۸ کی تشریح) سَبَحَ يَسْبَحُ کے معنی تیرنے کے ہیں۔پانی کی سطح پر کسی چیز کے تیرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز اپنے وجود کو پانی کی سطح کے اوپر برقرار رکھے ہوئے ہے۔اگر وہ چیز اپنی اس حالت کو برقرار نہیں رکھ سکے گی تو ڈوب جائے گی۔ اسی طرح کسی چیز کے خلا میں تیرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود کو اپنے مدار میں برقرار رکھے ہوئے ہے۔اسی سَبَحَ سے باب تفعیل میں فعل متعدی سَبَّحَ يُسَبِّحُ تَسْبِيْحًا ہے۔ تَسْبِيْح کے لغوی معنی ہیں ''تیرانا''۔اس مفہوم کے مطابق اللہ تعالیٰ کی ''تسبیح'' یہ ہے کہ اسے اس مقام پر رکھا جائے جو اس کے لائق ہے اور اس کی ذات کے ساتھ کوئی ایسا وصف یا تصور منسوب نہ کیا جائے جو اس کے شایانِ شان نہ ہو۔اگر کسی نے ایسا کیا تو اس نے گویا اللہ کو کھینچ کر (معاذ اللہ) نیچے مخلوقات کی صف میں کھڑا کر دیا۔لہٰذا جب ہم یہ اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر نقص' ہر عیب' ہر ضعف اور ہر احتیاج سے پاک ہے' تو گویا ہم اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں۔حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((اَلتَّسْبِيْحُ نِصْفُ الْمِيْزَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ يَمْلَؤُهُ))(۱) کہ تسبیح سے اللہ تعالیٰ کی معرفت کی میزان نصف ہو جاتی ہے اور ''الحمد للہ'' سے یہ میزان پر ہو جاتی ہے۔یعنی الحمد للہ کے کلمہ سے اس تصور کی تکمیل ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں وہ تمام کمالات موجود ہیں جن کا ہم تصور کر سکتے ہیں۔اس میں ہر حسن اور ہر کمال بہ تمام و کمال موجود ہے۔اس کا علم' اس کی حکمت' اس کی قدرت' غرض اس کی ہر صفت درجہ کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔

آیت ۴۱ ﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝۴۱﴾ ''اور ان کے لیے بہت بڑی نشانی ہے اس میں بھی کہ ہم نے اٹھایا ان کی نسل کو ایک بھری ہوئی کشتی میں۔''

---

(۱) سنن الترمذی' ابواب الدعوات' باب منه۔

بحری و بری سواریاں

یہ اللہ تعالیٰ کی تیسری نشانی ہے جس کا ذکر اس رکوع میں ہوا ہے۔ فُلک کے معنی کشتی کے ہیں۔ یہاں پر یہ لفظ (الفُلک) بطور اسم معرفہ آیا ہے۔ اس لیے متقدمین میں سے اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اس سے ایک معین کشتی یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی مراد ہے' جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام اور آپؑ کے اہل ایمان ساتھیوں کو سیلاب کی آفت سے محفوظ رکھا۔ اس سیلاب کے بعد نسل انسانی چونکہ حضرت نوح علیہ السلام کے ان بیٹوں ہی سے آگے چلی تھی جو کشتی میں آپؑ کے ساتھ سوار تھے' اس لیے آیت میں ان کے لیے ''ذُرِّيَّتَهُمْ'' کا لفظ آیا ہے۔ گویا اس کشتی میں اس وقت پوری نسل انسانی سوار تھی۔ البتہ اس بارے میں بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہاں الفُلک سے خاص (حضرت نوحؑ کی کشتی) کے بجائے عام کشتی ہی مراد لی جانی چاہیے۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ مہیب سمندروں کے اندر کشتیوں کا چلنا اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ واضح رہے کہ بادبانی کشتیوں کی تاریخ بہت پرانی ہے' اور نزولِ قرآن کے زمانے میں عربوں کے ہاں بڑی بڑی بادبانی کشتیوں کا استعمال عام تھا۔ البتہ بہت بڑے سمندری جہاز جدید دور کی پیداوار ہیں۔ بہرحال ان کشتیوں اور جہازوں کے ذریعے سے خوفناک سمندروں کا انسان کے لیے مسخر ہو جانا واقعی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نشانی ہے۔

آیت ۴۲ ﴿وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿۴۲﴾﴾ ''اور ہم نے بنایا ہے اسی کی مثل میں سے اور بھی بہت کچھ جس پر یہ سواری کرتے ہیں۔''

اگر تو الفُلک سے حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی مراد لی جائے تو آیت کے الفاظ مِنْ مِّثْلِهٖ کے مفہوم کا دائرہ کشتیوں اور سمندری جہازوں تک ہی محدود رہے گا۔ لیکن اگر اس سے عام کشتیاں مراد لی جائیں تو اس صورت میں وہ تمام چیزیں بھی مِنْ مِّثْلِهٖ کے زمرے میں آ جائیں گی جو بری' بحری' فضائی اور خلائی سواریوں کے طور پر انسان کے استعمال میں ہیں یا قیامت تک استعمال میں آئیں گی۔ یہ سواریاں چاہے جانور ہوں یا انسان کی ایجاد کی ہوئی مشینیں' انہیں کارآمد بنانے والی استعدادات اور صلاحیتیں تو ظاہر ہے اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے: ﴿اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ

سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ (الزخرف) کہ جب تم کسی سواری پر سوار ہوا کرو تو اللہ کی نعمتوں کو یاد کرتے ہوئے کہا کرو کہ پاک ہے وہ ذات جس نے اسے ہمارے بس میں کر دیا' حالانکہ ہم میں اسے قابو میں لانے کی طاقت نہیں تھی۔

اس ضمن میں یہاں یہ نکتہ بھی مدنظر رہنا چاہیے کہ جو چیزیں بظاہر انسان نے بنائی ہیں ان کی صلاحیتیں بھی اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کردہ ہیں۔ جیسے بجلی اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے' انسان کی نہیں۔ اسی طرح بھاپ اور اس کی طاقت بھی اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے' تمام قوانین فطرت بھی اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں۔ یہ قوانین جس نظام کے تحت کام کرتے ہیں وہ نظام بھی اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے۔ اس میں انسان کا کردار صرف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ان چیزوں اور قوتوں کو خاص نظم وضبط میں لا کر اپنے استعمال کے قابل بناتا ہے' لیکن اس حوالے سے بھی یہ حقیقت انسان کے پیش نظر رہنی چاہیے کہ وہ جس ذہانت اور صلاحیت سے یہ کارنامہ سرانجام دیتا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو زیر آسمان انسانی ماحول کی تعمیر وترقی میں خود انسان کے کردار کا حصہ بہت محدود ہے۔ انسان کھیت میں ہل چلاتا ہے' بیج بوتا ہے' اس کی آبیاری کرتا ہے' لیکن وہ بیج کو اُگا نہیں سکتا۔ اس بارے میں وہ خود بھی خوب جانتا ہے کہ:۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟

چنانچہ آیت زیر مطالعہ کا مفہوم اسی سیاق وسباق میں سمجھنا چاہیے کہ ہر زمانے کے انسانوں کے استعمال میں آنے والی ہر قسم کی سواریوں کو اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیا ہے۔

آیت ۴۳ ﴿وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴿۴۳﴾﴾ ''اور اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں' پھر نہ کوئی ہو ان کی فریاد سننے والا اور نہ وہ بچائے جا سکیں۔''

﴿وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ﴾ ''اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں''۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مظاہر دنیا آئے دن دیکھتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے تو ہزاروں ٹن وزنی جہاز کو سمندر کی لہریں تنکے کی طرح بہا لے جاتی ہیں۔

﴿فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴿۴۳﴾﴾ لفظ صریخ عربی میں درج ذیل چار معانی

دیتا ہے:

(i) فریاد (ii) فریادرسی (iii) فریادکرنے والا (iv) فریاد سننے والا

کلام کی جامعیت ملاحظہ ہو کہ اس جملے میں یہ چاروں معانی ایک ساتھ شامل مفہوم ہیں۔ مطلب یہ کہ جب ہم انہیں غرق کرنا چاہیں گے تو ان کے لیے نہ تو کوئی فریاد کا موقع ہوگا' نہ وہ فریاد کرسکیں گے اور نہ ہی ان کی فریاد سن کر کوئی ان کی مدد کو پہنچ سکے گا۔ ﴿وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴿٤٣﴾﴾ ''اور نہ ہی (کسی کی کوشش سے) انہیں بچایا جاسکے گا۔''

آیت ۴۴ ﴿اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿٤٤﴾﴾ ''مگر یہ ہماری رحمت ہی ہے (جو انہیں پار لگاتی ہے)' اور (زندگی سے) فائدہ اٹھانے کا موقع دیتی ہے ایک وقت خاص تک۔''

اگر کوئی انسان کسی جان لیوا حادثے سے بچ نکلتا ہے تو ہماری رحمت اور ہماری نظر کرم سے ہی بچ نکلتا ہے۔ تو مصیبت زدہ لوگوں کی فریاد سننے والے بھی ہم ہیں اور ڈوبتوں کو بچانے والے بھی ہم ہیں۔ اور یہ بچانا بھی کس لیے ہے؟ اس لیے کہ متعلقہ فرد ہماری مشیت سے ایک وقت معین تک کے لیے دنیا کے مال ومتاع سے مزید مستفید ہو لے۔

آیت ۴۵ ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٤٥﴾﴾ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ڈرو اس (عذاب) سے جو تمہارے سامنے ہے اور اس سے جو تمہارے پیچھے ہے' تاکہ تم پر رحم کیا جائے (تو یہ کان نہیں دھرتے)۔''

اِنذار کے جواب میں منکرین کا طرزِ عمل

﴿مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ﴾ کے مفہوم کی وضاحت مختلف مفسّرین نے مختلف انداز میں کی ہے۔ مثلاً بعض مفسرین کے نزدیک ﴿مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ﴾ سے انسانوں کے سامنے (زمانہ حال) کے اعمال مراد ہیں جبکہ بعض نے اس سے مخاطبین کا انجام مراد لیا ہے جو ان کے سامنے آنے والا ہے۔ اسی طرح ﴿وَمَا خَلْفَكُمْ﴾ سے اقوامِ سابقہ کے ساتھ پیش آنے والے واقعات بھی مراد لیے گئے ہیں' اور انسانوں کے وہ اعمال بھی جن کے نتائج ان کی زندگیوں میں پہلے (زمانہ ماضی میں) ظہور پذیر ہو چکے ہیں۔ البتہ میں سمجھتا ہوں کہ اس آیت

کا درست مفہوم تب واضح ہوتا ہے جب اسے سورۂ سباء کی آیت ۹ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے۔ واضح رہے کہ سورۃ سبا اور سورۂ یٰسٓ کا تعلق مکی سورتوں کے ایک ہی گروپ سے ہے۔ قبل ازیں تمہیدی کلمات میں مکی سورتوں کے دو درمیانی مجموعوں کی ۲۱ سورتوں (سورۃ الفرقان تا سورۃ السجدۃ' آٹھ سورتوں اور سورۃ سبا تا سورۃ الاحقاف ۱۳ سورتوں) کے مابین سورۂ یٰسٓ کی مرکزی حیثیت کا ذکر تفصیل سے ہو چکا ہے۔ اس حوالے سے یہاں یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ ۲۱ سورتوں کے گروپ کی مرکزی پانچ سورتیں (سورۂ سبا' سورۂ فاطر' سورۂ یٰسٓ' سورۃ الصافات اور سورۂ صٓ) مل کر ایک ضمنی گروپ بھی بناتی ہیں۔ اس ضمنی گروپ کے مرکز میں سورۂ یٰسٓ واقع ہے۔ جبکہ اس کے ایک طرف سورۂ سبا اور سورۂ فاطر کا جوڑا (ان دونوں سورتوں کا آغاز اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے کلمہ سے ہوتا ہے) اور دوسری طرف سورۃ الصافات اور سورۂ ص پر مشتمل جوڑا ہے۔ ان پانچوں سورتوں کے درمیان بہت سے پہلوؤں سے بہت گہری مناسبت پائی جاتی ہے۔ اس ضروری وضاحت کے بعد اب ہم آیت زیر مطالعہ کو سورۂ سبا کی آیت ۹ کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سورۂ سبا میں فرمایا گیا:

﴿اَفَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَیْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ ۝۹﴾

''کیا وہ نہیں دیکھتے اس کو جو ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے آسمان اور زمین میں سے؟ اگر ہم چاہیں تو انہیں زمین میں دھنسا دیں اور اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دیں۔ اس میں ایک نشانی ہے ہر انسان کے لیے جو اللہ کی طرف متوجہ ہو۔''

گویا ﴿مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ﴾ کے الفاظ ان دونوں آیات میں مشترک ہیں' صرف حاضر اور غائب کے صیغوں کا فرق ہے۔ لیکن اس کے بعد سورۂ سبا کی اس آیت میں ﴿مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ کے جو الفاظ آئے ہیں وہ سورۂ یٰسٓ کی زیر مطالعہ آیت میں محذوف ہیں' کہ قرآن مجید کا طالب علم یا قاری قرآن مجید کے نظائر کی مدد سے اس خلا کو خود پر کرے۔ چنانچہ اگر زیر مطالعہ آیت میں مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (وہی الفاظ جو سورۂ سبا کی

مذکورہ آیت میں آئے ہیں) کے الفاظ کو محذوف مانا جائے تو آیت کا مفہوم یوں ہوگا: ''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ڈرو اللہ کے اس عذاب سے جو آسمان یا زمین سے تم پر کسی وقت بھی آ سکتا ہے.....'' واضح رہے کہ یہ مضمون قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے' بلکہ سورۃ الانعام میں آسمانی اور زمینی عذاب کے علاوہ عذاب کی ایک تیسری قسم سے بھی خبردار کیا گیا ہے: ﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ۭ﴾ (الانعام:٦٥) یعنی اللہ تعالیٰ تم پر تیز آندھی' پتھراؤ' زالہ باری وغیرہ کی صورت میں تمہارے اوپر سے بھی عذاب بھیج سکتا ہے اور اس کے عذاب کے سوتے زلزلوں' سیلابوں وغیرہ کی صورت میں تمہارے قدموں کے نیچے سے بھی پھوٹ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ تمہارے مختلف گروہوں کو آپس میں ٹکرا کر بھی تمہیں تباہ و برباد کر سکتا ہے —— اور کسی قوم کے اندر نسلی' لسانی' علاقائی عصبیتوں کے حامل گروہوں کے درمیان خانہ جنگی کی کیفیت بلاشبہ عذاب کی بدترین صورت ہے۔ بدقسمتی سے مختلف ادوار اور مختلف علاقوں میں اُمت مسلمہ بھی بہت بری طرح اس عذاب کی زد میں آتی رہی ہے۔

﴿لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝۴۵﴾ ''(اگر تم ڈر کر سنبھل جاؤ گے) تو شاید تم پر رحم کیا جائے''۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: ﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ﴾ ''بعید نہیں کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے' لیکن اگر تم نے پھر وہی کیا جو پہلے کیا تھا تو ہم بھی وہی کریں گے (جو ہم نے پہلے کیا تھا)۔'' ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کا قانون کسی کے لیے بدلتا نہیں۔ چنانچہ اگر تم اپنی غلط روش سے رجوع کر لو گے اور اللہ تعالیٰ کی جناب میں توبہ کر لو گے تو اس کی رحمت پھر سے تمہیں اپنے دامن میں لے لے گی۔ لیکن اگر تم احکامِ شریعت سے اعراض کی روش سے باز نہ آئے تو پھر ہم بھی اسی طرح تمہیں سزا دیں گے جیسے ہم نے تم سے پہلی قوموں کو دی تھی۔

آیت ۴۶ ﴿وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ۝۴۶﴾

''اور نہیں آتی ان کے پاس ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی مگر یہ کہ وہ اس سے اعراض ہی کرتے رہے ہیں۔''

اس آیت کی حیثیت اس رکوع کے مرکزی مضمون پر گویا اختتامی تبصرے

(concluding remarks) کی سی ہے۔ اس اعتبار سے یہ آیت دوسرے رکوع کی آیت ۳۰ سے گہری مشابہت رکھتی ہے۔ یاد رہے کہ دوسرے رکوع کا مضمون رسالت سے متعلق ہے' اس مضمون کا اختتام اس تبصرے پر ہوا ہے: ﴿یٰحَسۡرَةً عَلَی الۡعِبَادِ ۚ مَا یَاۡتِیۡهِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا کَانُوۡا بِهٖ یَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۳۰﴾﴾ ''حسرت ہے ان بندوں پر کہ ان کے پاس جو بھی رسول آیا وہ اس کا مذاق ہی اڑاتے رہے''۔ اب زیر مطالعہ رکوع میں آیاتِ الٰہیہ کے ذکر کے بعد اس بارے میں انسانوں کے عمومی رویے پر بالکل اسی انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا: ''اور نہیں آتی ان کے پاس ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی مگر یہ کہ وہ اس سے اعراض ہی کرتے رہے ہیں۔'' یعنی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے مشاہدے سے لوگوں کی اکثریت نے کوئی نصیحت اور تذکیر حاصل نہیں کی۔

ایمان اور اخلاقِ حسنہ لازم و ملزوم

اب اگلی آیت کے مضمون کا تعلق اخلاقِ حسنہ سے ہے۔ اخلاقِ حسنہ کی بنیاد ایمان پر ہے۔ ظاہر ہے جو انسان اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا' اس کے لیے اخلاقیات (morality) کا سرے سے کوئی جواز ہی نہیں رہ جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ مکی سورتوں میں عموماً اور ابتدائی مکی سورتوں میں خصوصاً' ایمان اور اخلاقِ حسنہ کے مضامین اکثر مقامات پر اکٹھے نظر آتے ہیں۔ مثلاً سورۃ الماعون میں ارشاد ہوا: ﴿اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ ﴿۱﴾ فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ ﴿۲﴾ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ﴿۳﴾﴾ ''کیا تم نے غور کیا اس شخص کی حالت پر جو جزا و سزا کا منکر ہے۔ یہی وہ شخص ہے جو یتیم کو دھتکارتا ہے' اور کسی مسکین کو کھانا کھلانے پر ترغیب نہیں دیتا۔'' سورۃ الماعون کی ان آیات کے مفہوم میں یہ اشارہ بھی پایا جاتا ہے کہ ایسا شخص خود بھی کسی مسکین کو دو لقمے کھلانے کا روادار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حفظِ ماتقدم کے طور پر وہ کسی دوسرے شخص کو بھی اس بھلے کام کی ترغیب نہیں دیتا۔ مبادا کہ کوئی پلٹ کر یہ کہہ دے کہ یہ نیک کام تم خود کیوں نہیں کرتے ہو؟ یہاں پر اصل نکتہ سمجھنے کا یہ ہے کہ ایسے اخلاقی دیوالیہ پن کا شکار صرف وہی شخص ہو سکتا ہے' جو اللہ اور آخرت کا منکر ہو۔ گویا اخلاق کی یہ پستی انکارِ توحید و آخرت کا لازمی نتیجہ ہے۔

سورۃ الماعون کا یہی مضمون عکسی ترتیب کے ساتھ سورۃ المطففین کی ابتدائی آیات میں

بایں الفاظ آیا ہے: ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ① الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ② وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ③ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ④ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ⑤ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ⑥﴾ ''تباہی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے۔ وہ لوگ کہ جب وہ دوسروں سے ناپ تول کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں' اور جب ان کے لیے ناپتے ہیں یا انہیں تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ ذرا بھی خیال نہیں کرتے کہ وہ یقیناً اٹھائے جانے والے ہیں ایک عظیم دن (کی پیشی) کے لیے؟ جس دن لوگ ربّ العالمین کے حضور کھڑے ہوں گے۔''

تو معلوم ہوا کہ اللہ اور آخرت پر انسان کا ایمان ہوگا تو اس کا اخلاقی رویہ بھی درست ہوگا۔ اگر یہ ایمان نہیں ہوگا تو اس کی اخلاقیات کے لیے کوئی بنیاد ہی نہیں رہ جائے گی۔ اس تمہیدی وضاحت کو مدنظر رکھتے ہوئے اب اگلی آیت میں ان لوگوں کے کردار کا نقشہ ملاحظہ کیجیے جو ایک طرف تو اخلاقی پستی کی انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں' مگر دوسری طرف بقول اقبال ذہانت اور منطق کی دلیلوں میں بدستور چالاک و بے باک ہیں: ؎

محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروّت ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک

آیت ۴۷ ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ⑰﴾ ''اور جب کہا جاتا ہے ان سے کہ خرچ کرو اس میں سے جو اللہ نے تم کو رزق دیا ہے تو کفر کرنے والے ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں: کیا ہم انہیں کھلائیں کہ اگر اللہ چاہتا تو خود انہیں کھلا دیتا؟ نہیں ہو تم مگر کھلی گمراہی میں۔''

منکرین کی انوکھی منطق

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ﴾ ''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خرچ کرو اس رزق میں سے جو اللہ نے تمہیں دے رکھا ہے'' جب ان کے اہلِ ثروت لوگوں کو ترغیب دی جاتی ہے کہ تمہیں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ رزق میں سے مسکینوں' یتیموں اور محتاجوں پر بھی خرچ کرتے رہو تو: ﴿قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ

اَطْعَمَهٗٓ﴾ ''کفر کرنے والے ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کیا ہم انہیں کھلائیں کہ اگر اللہ چاہتا تو خود انہیں کھلا دیتا؟''

بھلائی اور خلق خدا کی بہبود کے عمل سے راہِ فرار اختیار کرنے کی منطق کے طور پر ان لوگوں کا یہ ''ترکی بہ ترکی'' جواب سنئے اور ان کی ''ذہانت'' کی داد دیجیے کہ اللہ تو سب کا رازق ہے' وہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے۔ وہ اگر ہمیں نواز سکتا ہے تو ان غریب غرباء کو بھی ضرور دے سکتا ہے۔ اس نے اگر انہیں تنگ دست رکھا ہے تو یہ اس کی طے شدہ تقدیر ہے اور اس کی مشیت و مرضی اسی میں ہے۔ اب اگر ہم انہیں کھلائیں پلائیں گے اور ان کی تکالیف رفع کرنے کے لیے اپنا مال صرف کریں گے تو ظاہر ہے یہ اللہ کی مشیت اور تقدیر کے سراسر خلاف ہوگا۔ تو کیا ہم اللہ کی تقدیر کو اُلٹ دیں؟ کیا ہم اللہ کی مشیت کو چیلنج کر دیں؟ ذرا ہوش کے ناخن لو! کیا تم ہمیں اللہ کے فیصلوں کے خلاف اُکسا رہے ہو؟

﴿اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝۴۷﴾ ''نہیں ہو تم مگر کھلی گمراہی میں''۔ تمہاری ان باتوں سے تو ثابت ہوتا ہے کہ تم بالکل ہی بہک گئے ہو۔ بلکہ اب اللہ تعالیٰ کی مشیت کے خلاف ترغیب دے کر تم لوگ ہمیں بھی گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو! اس مفہوم میں اس فقرے کو مذکورہ لوگوں کے گزشتہ قول کا تسلسل سمجھا جائے گا۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ فقرہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے قول پر تبصرہ ہو کہ اے گروہِ کفار انفاقِ مال سے بچنے کے لیے اپنی خود ساختہ منطق کے تانے بانے بنتے ہوئے تم لوگ گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہو۔

اگر یہ فقرہ انہی لوگوں کے قول کا تسلسل ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول پر کوئی تبصرہ نہیں فرمایا۔ گویا اس فقرے سے ان کی سوچ کی کجی اور ان کے باطن کی خباثت و شناعت اس قدر عیاں ہے کہ اس کا جواب دینا یا اس پر تبصرہ کرنا بھی تحصیل حاصل (جو چیز از خود حاصل ہو اس کے حصول کی کوشش کرنے) کے مترادف ہے' جو اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں۔

آیت ۴۸ ﴿وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝۴۸﴾ ''اور یہ لوگ کہتے ہیں کب پورا ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو!''

اس آیت میں خصوصی طور پر مشرکینِ مکّہ کی متکبّرانہ سوچ اور خوئے اعراض و استہزاء کی

کیفیت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ یہ لوگ اکثر حضور ﷺ اور اہلِ ایمان کو مخاطب کر کے استہزائیہ انداز میں فقرے کستے رہتے تھے کہ جس قیامت کے بارے میں تم لوگ ہمیں دھونس دیتے چلے آ رہے ہو وہ آخر کہاں رہ گئی ہے؟ تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ قیامت آئے گی تو سب لوگوں کو پھر زندہ کر لیا جائے گا اور ان کی سزا و جزا کے فیصلے ہوں گے' اور یہ کہ اگر ہم نے تمہاری بات نہ مانی تو اس دن ہمیں جہنم کی آگ میں جھونک دیا جائے گا۔ اگر تم قیامت کے بارے میں واقعی اتنا کچھ جانتے ہو تو ذرا یہ بھی بتا دو کہ وہ کب آئے گی؟ ﴿مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۴۸﴾ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو لگے ہاتھوں قیامت کے دن اور وقت کا تعین بھی کر دو۔

آیت ۴۹ ﴿مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ۝۴۹﴾ ''یہ نہیں انتظار کر رہے مگر ایک چنگھاڑ کا جو انہیں آ لے گی اس حالت میں کہ وہ باہم جھگڑ رہے ہوں گے۔''

﴿مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً﴾ یعنی ان کی ایسی باتوں سے تو لگتا ہے کہ وہ اللہ کے عذاب کی چنگھاڑ ہی کے منتظر ہیں۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سب کچھ بالکل اچانک ہوگا۔ جب ان کے بارے میں عذاب کا فیصلہ ہو جائے گا تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کو کوئی خاص اہتمام نہیں کرنا پڑے گا۔ بس ایک صَيْحَة (چنگھاڑ) ہی ان کو نیست و نابود کرنے کے لیے کافی ہوگی۔ یہ وہی بات ہے جو قبل ازیں دوسرے رکوع میں بایں الفاظ بیان ہوئی ہے: ﴿اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ۝۲۹﴾ کہ وہ متکبر لوگ جو رسولوں کے خلاف انتہائی اقدام کرنے کے لیے آپے سے باہر ہو رہے تھے وہ سب کے سب ایک چنگھاڑ کی تاب نہ لاتے ہوئے پلک جھپکنے کی دیر میں ختم ہو کر رہ گئے۔

﴿تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ۝۴۹﴾ یعنی وہ چنگھاڑ انہیں اچانک آ لے گی اس حالت میں کہ وہ لوگ اپنی منطقی دلیلوں کے بل پر بحث و تکرار کر رہے ہوں گے۔

آیت ۵۰ ﴿فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ۝۵۰﴾ ''پھر نہ تو وہ وصیت کر سکیں گے اور نہ ہی اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ سکیں گے۔''

وہ چنگھاڑ ایسی جان لیوا ہوگی کہ جو جہاں ہوگا' وہیں بجھ کر رہ جائے گا۔ کسی کو اتنی مہلت بھی نہیں ملے گی کہ وہ کوئی وصیت ہی کر سکے اور نہ ہی ان میں سے کوئی شخص اپنے اہل و عیال کی

طرف لوٹ کر جا سکے گا۔ اس سورۂ مبارکہ کے اسلوب اور آہنگ کے ساتھ جس شخص کو خصوصی مناسبت پیدا ہو جائے اسے محسوس ہوگا کہ یہاں اس رکوع کے اختتام تک اس کا مرکزی مضمون اپنے tempo کے اعتبار سے کلائمکس کو پہنچ گیا ہے۔ اور یہ کہ اپنے مضمون اور اسلوب کے اعتبار سے یہ رکوع واقعی اس سورت کے ''قلب'' کی حیثیت رکھتا ہے۔

پہلے تین رکوعوں کے مضامین کا اجمالی جائزہ

پہلے رکوع کی ابتدائی آیات میں نبی اکرم ﷺ سے براہِ راست خطاب ہے۔ اس کے بعد مکہ میں آپؐ کی دعوت سے پیدا ہونے والی صورت حال' خصوصی طور پر قریش کے انکار و اعراض کی کیفیت کا نقشہ دکھایا گیا اور اس ضمن میں یہ وضاحت بھی کر دی گئی کہ اس کے بعد ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

دوسرے رکوع میں رسالت سے متعلق مسائل و مضامین کے حوالے سے ایک بستی کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ اس بستی والوں کی طرف پے در پے تین رسول بھیجے گئے' مگر وہ لوگ کفر و انکار پر اڑے رہے' بلکہ انہوں نے ان رسولوں کے خلاف انتہائی اقدام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس صورت حال میں اس بستی کے ایک صاحبِ ایمان شخص نے رسولوں کے حق میں کھڑے ہو کر کلمۂ حق کہا تو اسے شہید کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ قوم اللہ تعالیٰ کے عذاب کی زد میں آ کر ہلاک ہو گئی۔ اس واقعہ کے ذریعے مکہ کے معروضی حالات میں ایک طرف حضور ﷺ اور مسلمانوں کی دلجوئی فرمائی گئی تو دوسری طرف کفارِ قریش کے لیے یہ پیغام دیا گیا کہ تم لوگ جس راستے پر بگٹٹ دوڑے چلے جا رہے ہو اس راستے کی منزل بالآخر وہی انجام ہے جس سے اس بستی کے باشندے دوچار ہوئے تھے۔

تیسرے رکوع کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ اپنے مضمون (توحید) کے اعتبار سے یہ رکوع اس سورت کے ''قلب'' کی حیثیت رکھتا ہے۔ (ظاہری اعتبار سے بھی یہ رکوع سورت کے عین درمیان میں واقع ہے)۔ اس رکوع میں آیاتِ الٰہیہ (اللہ تعالیٰ کی نشانیوں) کے حوالے سے توحید کا مضمون اجاگر کیا گیا ہے۔ اس رکوع کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ ایک سلیم العقل اور سلیم الفطرت انسان کے حق میں کائنات (اللہ تعالیٰ کی نشانیوں) کے مشاہدے کے ذریعے درج ذیل دو نتائج لازمی نکلنے چاہئیں:

تذکّر: یہ یاددہانی اور نصیحت کہ اس کائنات کی ہر چیز اللہ کی حکمت' اس کے کمالِ قدرت اور کمالِ علم کی نشانی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ان نشانیوں کے بامقصد مشاہدے سے ایک باشعور انسان کے دل و دماغ میں اللہ تعالیٰ کی یاد تازہ ہو جانی چاہیے۔

تشکّر: اللہ کے تذکر اور اس کی یاد کے نتیجے میں ایک سلیم الفطرت انسان کے دل سے شکر کے سوتے پھوٹنے چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے مشاہدے سے ایک باشعور انسان کو اس حقیقت تک پہنچنے میں دیر نہیں لگتی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تخلیق کردہ ان چیزوں کو انتہائی مربوط و منظم انداز میں انسان کی خدمت پر مامور کر رکھا ہے۔ مثلاً سورج جہاں اللہ تعالیٰ کی عظمت کا نشان ہے وہاں یہ ہواؤں کے چلنے' بارشوں کے برسنے' موسموں کے ادلنے بدلنے' رات دن کے آنے جانے' زمین پر روشنی اور حرارت پہنچانے' فصلوں اور پھلوں کے پکنے اور ہر قسم کے نباتات کی زندگی کو برقرار رکھنے کا ذریعہ بن کر گویا بنی نوع انسان کی خدمت میں مصروف ہے۔ اور اس حیثیت سے یہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے ایسے آثار کے مشاہدے کے نتیجے میں ایک سلیم العقل اور سلیم الفطرت انسان کو احسان مندی اور شکر کے جذبات سے سرشار ہو کر بے اختیار اللہ تعالیٰ کے حضور جھک جانا چاہیے۔

رکوع ۴

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا
مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾
اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَالْيَوْمَ لَا
تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۴﴾ اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ
الْيَوْمَ فِيْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ
مُتَّكِـُٔوْنَ ﴿۵۶﴾ لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ﴿۵۷﴾ سَلٰمٌ ۚ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ
رَّحِيْمٍ ﴿۵۸﴾ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ
اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۶۰﴾ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا
صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ۭ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا

تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۲﴾ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۶۳﴾ اِصْلَوْهَا الْیَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ
تَكْفُرُوْنَ ﴿۶۴﴾ اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤی اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَاۤ اَیْدِیْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ
بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰۤی اَعْیُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰی
یُبْصِرُوْنَ ﴿۶۶﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰی مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِیًّا وَّلَا
یَرْجِعُوْنَ ﴿۶۷﴾

چوتھے رکوع کا مرکزی مضمون آخرت ہے۔ لیکن اس رکوع کے اندر توحید اور رسالت کے مضامین بھی کسی نہ کسی انداز میں اس مرکزی مضمون کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ توحید' رسالت اور آخرت دراصل مکی سورتوں کے بنیادی مضامین ہیں۔ طویل مکی سورتوں میں یہ تینوں مضامین ایک ساتھ اس طرح چلتے نظر آتے ہیں کہ ہر طویل مکی سورت میں ان میں سے کسی ایک مضمون کو مرکزی حیثیت حاصل ہے' جبکہ باقی دو مضامین مرکزی مضمون کے تابع ہو کر ضمناً آئے ہیں۔ البتہ مختصر مکی سورتوں میں عام طور پر ان میں سے کوئی ایک مضمون ہی آتا ہے' جیسے سورۃ الاخلاص کا موضوع صرف توحید ہے۔ سورۂ یٰسٓ میں بھی عام مکی سورتوں کی طرح مذکورہ تینوں مضامین کا ذکر ہے' لیکن سورت کے اندر ان مضامین کی تقسیم بالکل منفرد انداز میں ہوئی ہے۔ اس سورت کے پہلے دو رکوع صرف رسالت کے مضمون کے لیے مختص ہیں۔ پھر تیسرے رکوع میں توحید اور معرفتِ خداوندی کا بیان ہے۔ اس کے بعد چوتھے اور پانچویں رکوع کا مرکزی مضمون آخرت ہے' لیکن اس مضمون کے ساتھ ضمناً توحید اور رسالت کے مضامین بھی آئے ہیں اور یہ تینوں موضوعات آپس میں اس طرح گندھے ہوئے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔ اس اسلوب میں اس سورت کے یہ دو رکوع سورۃ السجدہ سے مشابہ ہیں۔ ان دونوں رکوعوں کے آہنگ (rhythm) میں دل کی دھڑکن کا انداز بہت نمایاں ہے۔

آیت ۵۱ ﴿وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰی رَبِّهِمْ یَنْسِلُوْنَ ﴿۵۱﴾﴾

''اور صور میں پھونکا جائے گا تو یکایک یہ لوگ قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف چل پڑیں گے۔''

نفخۂ صور اور اس کے مرحلے

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ﴾ اس جملے کا ترجمہ یوں بھی کیا جا سکتا ہے: ''اور پھونک دیا گیا صور میں۔''

نُفِخَ فعل ماضی مجہول ہے۔ لغوی معنی ہیں: ''پھونکا گیا''۔ قرآن مجید میں آخرت و قیامت کے واقعات کے ذکر کے لیے اکثر ماضی کا صیغہ آیا ہے، حالانکہ ہمارے لیے وہ مستقبل کے واقعات ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی کے صیغہ ماضی میں فعل ماضی کے معنی کے ساتھ ساتھ قطعیت اور حتمیت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے جو چیز واقع ہو چکی ہو اس کے بارے میں شک نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ قیامت اور آخرت کے حالات و واقعات کی قطعیت اور حتمیت کو ظاہر کرنے کے لیے قرآن مجید میں ان کا ذکر اکثر ماضی کے صیغہ میں ہوا ہے۔ اس ضمن میں یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ ماضی، حال اور مستقبل کی تقسیم کا تعلق ہم انسانوں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کل علم (مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ) تو ہر لمحہ اس کے سامنے موجود ہے، جیسے سورۃ المعارج میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝٦ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۝٧﴾ ''بے شک یہ لوگ اس (قیامت) کو دور سمجھتے ہیں جبکہ ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں۔''

صور میں پھونکے جانے کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ سورۃ الزمر کے آخر میں خصوصیت کے ساتھ ذکر ہوا ہے کہ صور دو مرتبہ پھونکا جائے گا:

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۭ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۝٦٨﴾

''اور صور میں پھونکا جائے گا تو بے ہوش کر گر پڑیں گے وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں، سوائے ان کے جن کے بارے میں اللہ چاہے۔ پھر پھونکا جائے گا اس میں دوسری بار تو یکایک وہ سب اٹھ کھڑے ہوں گے دیکھتے ہوئے۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ ایک حدیث میں اس مضمون کی مزید وضاحت ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفخہ صور تین مرتبہ ہوگا:

(۱) نَفْخَةُ الْفَزَعِ: یہ پہلا نفخہ ہوگا۔ اس سے زمین و آسمان کی تمام مخلوق شدید گھبراہٹ کے عالم میں سہم جائے گی اور پوری کائنات میں شدید ہلچل پیدا ہو جائے گی: ﴿يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ

كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ﴿٤﴾ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ﴿٥﴾﴾(القارعة) ''اُس دن انسان بکھرے ہوئے پتنگوں کی مانند ہوں گے' اور پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کے مانند ہو جائیں گے''۔ سورۃ الحج کی ابتدائی آیات میں اس غیر معمولی صورت حال کا ذکر بایں الفاظ ہوا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ﴿١﴾ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ﴿٢﴾﴾

''لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو' بلاشبہ قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہے۔ جس دن تم اسے دیکھ لو گے ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی اور تمام حمل والیوں کے حمل گر جائیں گے اور تم دیکھو گے کہ لوگ مدہوش دکھائی دیں گے' حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے' بلکہ اللہ کا یہ عذاب بہت سخت ہوگا۔''

اس کے علاوہ نفخہ اولیٰ کی کیفیت کا ذکر سورۃ النمل آیت ۸۷ اور ۸۸ میں بھی آیا ہے۔

(ii) **نفخة الصّعق** : دوسری مرتبہ جب صور میں پھونکا جائے گا تو دفعتاً ایک عمومی موت سب پر طاری ہو جائے گی۔

(iii) **نفخة القيام** : اس کے بعد کسی وقت تیسرا نفخہ ہوگا' جس کے نتیجے میں سب لوگ کھڑے ہو جائیں گے۔ سورۃ الزمر کی اس آیت میں اسی نفخہ کا ذکر ہے: ﴿ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ﴿٦٨﴾﴾ ''پھر ایک مرتبہ اور اس میں پھونکا جائے گا تو اچانک سب لوگ کھڑے ہو جائیں گے دیکھتے ہوئے۔''

ان میں سے ہر نفخہ کے درمیان کتنا وقفہ ہوگا؟ یہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں وقت کے اپنے پیمانے ہیں۔ جیسے سورۃ المعارج کی آیت ۴ سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ کے ہاں ایک دن ہمارے پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔ بہرحال آیت زیر مطالعہ میں ''نفخہ قیامت'' یعنی تیسرے نفخے کا ذکر ہے' جس کے نتیجے میں تمام انسان زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ حیرت اور گھبراہٹ میں انہیں کچھ نہیں سوجھ رہا ہوگا کہ وہ کہاں تھے اور اب کہاں سے انہیں اٹھا لیا گیا ہے۔

﴿فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ﴿٥١﴾﴾ ''تو یہ لوگ فوراً اپنی قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف چل پڑیں گے۔'' ایسے فقروں میں لفظ اِذَا فوراً یا اچانک کے معنی

دیتا ہے۔

آیت ۵۲ ﴿قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾﴾ ''(اُس وقت) وہ کہیں گے: ہائے ہماری شامت! کس نے ہمیں اٹھایا ہے ہماری قبروں سے؟ یہ ہے وہ جس کا وعدہ کیا تھا رحمٰن نے اور سچ کہا تھا رسولوں نے۔''

﴿قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا﴾ ''وہ کہیں گے کہ ہائے ہماری شامت! ہمیں ہماری قبروں سے کس نے اٹھا دیا ہے؟'' رُقُوْد کے معنی سونے یا لیٹنے کے ہیں۔ مَرْقَد وہ جگہ ہے جہاں کوئی شخص لیٹا ہو یا سویا ہوا ہو۔

﴿هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾﴾ ''یہ ہے وہ جس کا رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں نے سچ کہا تھا۔'' اس فقرے کے بارے میں ایک رائے تو یہ ہے کہ یہ پچھلے فقرے کا ہی تسلسل ہے۔ یعنی تیسرے نفخہ (نفخة القيام) کے بعد جب وہ لوگ اٹھیں گے اور ہوش میں آئیں گے تو وہ حیران و پریشان ہوں گے کہ یہ ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے؟ کس نے ہمیں ہماری قبروں سے یوں اچانک اٹھا دیا ہے۔ پھر اچانک انہیں سب کچھ یاد آ جائے گا اور وہ پکار اٹھیں گے: ہائے ہماری شامت! یہ تو وہی وقت اور وہی واقعہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کر رکھا تھا' اور جس کی خبر اللہ کے سب رسول دیتے چلے آئے تھے۔ میرے نزدیک یہی رائے اقرب ہے۔ سورۃ الصافات کی درج ذیل آیات بھی اسی رائے کی تائید کرتی ہیں: ﴿فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۲۰﴾﴾ ''تو وہ بس ایک ڈانٹ ہوگی' تو اچانک وہ دیکھتے ہوئے ہوں گے۔ اور وہ کہیں گے کہ ہائے ہماری شامت' یہ ہے وہ جزا و سزا کا دن!'' البتہ مذکورہ فقرے کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ ان لوگوں کی ﴿يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا﴾ کی دہائی کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ندا لگائے گا: ﴿هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾﴾ کہ یہ ہے وہ دن جس کا تم سے رحمٰن نے وعدہ کر رکھا تھا' اور تمہاری طرف جو رسول آتے رہے تھے وہ بھی تم لوگوں کو اس دن کی خبر دیتے رہے تھے۔

آیت ۵۳ ﴿اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۵۳﴾﴾ ''وہ بس ایک چنگھاڑ ہوگی اور پھر وہ سب کے سب ہمارے سامنے حاضر کر دیے جائیں گے۔''

نوٹ کیجیے اس سورۂ مبارکہ میں لفظ صَیحۃ (چیخ یا چنگھاڑ) یہاں تیسری بار آیا ہے۔ اس سے پہلے یہ لفظ آیت ۲۹ اور آیت ۴۹ میں بھی آ چکا ہے۔ یہ دراصل سورتوں کے اپنے اپنے اسلوب کی تخصیص کا معاملہ ہے۔ بعض سورتوں میں بعض الفاظ یا مضامین بار بار آتے ہیں۔ بہرحال قرآن مجید میں صَیحۃ کا ذکر اللہ تعالیٰ کے عذاب کے حوالے سے بھی آیا ہے۔ ماضی میں کئی اقوام ایسی گزری ہیں جن پر عذابِ خداوندی ایک خوفناک چیخ یا چنگھاڑ (صَیحَۃ) کی شکل میں آیا اور اس سے متعلقہ قوم کے تمام افراد ہلاک ہو گئے۔ نفخہ اولیٰ اور نفخہ ثانیہ میں بھی ایسی ہی کوئی خوفناک آواز ہوگی جس سے تمام انسانوں پر موت طاری ہو جائے گی۔

آیات زیر مطالعہ میں اس سورۂ مبارکہ کا پُرتاثیر اسلوب بہت واضح انداز میں جھلک رہا ہے۔ کسی گفتگو یا تقریر کے اندر ایسی غیر معمولی تاثیر منطقی استدلال سے نہیں بلکہ متکلم یا مقرر کے یقین کی پختگی سے پیدا ہوتی ہے۔ جب کسی متکلّم یا خطیب کے رگ و پے میں پختہ و کامل یقین سرایت کیے ہوئے ہو تو اس کے اس یقین کی تاثیر سامعین کے قلوب و اذہان کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی۔ یہ اس سورۂ مبارکہ کا وہ انداز ہے جس سے مردہ دلوں کو نئی زندگی اور ایمان و ایقان کی سرد مہری کو تازہ حرارت نصیب ہوتی ہے۔

آیت ۵۴ ﴿فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۴﴾﴾

''تو آج کے دن کسی جان پر کوئی ظلم نہ ہوگا اور تمہیں نہیں بدلہ دیا جائے گا مگر وہی جو کچھ تم عمل کرتے رہے۔''

﴿فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا﴾ تو آج کے دن کسی جان پر کسی قسم کا ظلم نہیں ہوگا۔ نہ تو کسی کو کسی ناکردہ گناہ کی سزا ملے گی' اور نہ ہی کسی کے ایثار و خلوص کا کوئی دقیقہ فروگزاشت ہوگا۔

.....تُو عرصۂ محشر میں ہے!

اپنے اسلوب کے اعتبار سے یہ آیت گویا ''تصویر حال'' ہے۔ اگر انسان اسے حاضر دماغی سے پڑھے تو اسے محسوس ہوگا کہ وہ اس وقت میدانِ محشر میں کھڑا ہے' اور یہ مکالمہ اور مخاطبہ اس کے سامنے ہو رہا ہے۔ اسی طرح علامہ اقبال کا یہ شعر بھی ''تصویر حال'' کا درجہ رکھتا ہے:۔

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!

اے انسان! اس دنیا میں رہتے ہوئے تو معرضِ امتحان میں ہے' اللہ تعالیٰ نے تجھے بہت سی صلاحیتیں عطا کر کے اس دارالامتحان میں بھیجا ہے۔ اب تجھ پر لازم ہے کہ تو اپنی مہلت زندگی میں اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ ان صلاحیتوں کو بہتر سے بہتر انداز میں بروئے کار لاتے ہوئے اعمال کے میدان میں حتی الوسع اچھی کارکردگی دکھائے۔ یہی مضمون علامہ اقبال نے ایک فارسی شعر میں بایں الفاظ بیان کیا ہے:۔

بر آور ہر چہ اندر سینہ داری سرودے' نالۂ' آہے' فغانے!

کہ اے انسان! تیرے سینے میں جو کچھ بھی ہے اسے باہر نکالو۔ بے شک وہ راگ ہو' نالہ و فریاد ہو یا آہ و فغاں ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو جو صلاحیتیں دے رکھی ہیں ان سب کو میدانِ عمل میں بروئے کار لاؤ۔ ظاہر ہے یہ دنیا انسان کے لیے دارالامتحان ہے' جبکہ قیامت کا دن اس کے لیے اس امتحان کے نتائج دیکھنے کا دن ہوگا۔ چنانچہ اگر انسان دارالامتحان میں رہتے ہوئے نتائج کے دن کا تصور اپنے ذہن میں مستحضر رکھے گا تو اس کی محنت اور کوشش کی سمت درست رہنے کا امکان ہے۔

﴿وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۵۴﴾ ''اور تمہیں نہیں بدلہ دیا جائے گا مگر وہی کچھ جو تم عمل کرتے رہے ہو''۔ سورۂ یونس کی آیت ۵۲ میں اس مضمون کے حوالے سے ﴿هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی وہاں 'مَا' سے پہلے حرف 'بِ' کا اضافہ ہوا ہے۔ ان دونوں اسالیب میں فرق یہ ہے کہ بِمَا کے مفہوم میں بدلے کی شکل تبدیل ہونے کا امکان پایا جاتا ہے۔ یعنی عمل کا بدلہ اس کے وزن یا تناسب سے تو ہوگا' لیکن ہو سکتا ہے کسی اور شکل میں ہو۔ جبکہ مَا میں یہ مفہوم پایا جاتا ہے کہ جو عمل ہوگا بعینہٖ وہی سامنے آ جائے گا' اس میں کسی قسم کا کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوگا۔ دراصل دنیا میں انسانی اعمال و افعال کے اوپر آزمائش کے پردے پڑے ہوئے ہیں' جس کی وجہ سے یہاں کسی عمل کی اصل شکل اور تاثیر ہمارے سامنے نہیں آتی۔ قیامت کے دن یہ پردے ہٹا لیے جائیں گے اور ہر عمل اپنی اصل شکل کے ساتھ ''کاسب'' کے سامنے آئے گا۔ مثلاً جھوٹ کے اندر ظلمت ہے۔ یہ ظلمت دنیا میں ہمیں نظر نہیں آتی' جبکہ قیامت کے دن ایک ایک جھوٹ کی ظلمت ظاہر ہو جائے گی۔

اسی طرح دنیا میں حرام خوری کی تاثیر بھی ظاہر نہیں ہوتی اور sugar coated pills کی طرح اس کی تلخی آزمائش کے پردوں میں چھپی رہتی ہے۔ تاہم قیامت کے دن ظاہری پردے ہٹا کر حرام کا کھایا پیا تمام تر تلخی اور تعفن سمیت متعلقہ انسان کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔

آیت ۵۵ ﴿اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِيْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ۝۵۵﴾ ''جنتی لوگ اُس دن اپنے مشاغل میں ہشاش بشاش ہوں گے۔''

اہلِ جنت کے مشاغل

﴿فِيْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ۝۵۵﴾ وہ جنت میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کے درمیان خوشیاں منا رہے ہوں گے۔ فاکھة (جمع فواکہ) کے لغوی معنی پھل وغیرہ کے ہیں۔ آگے آیت ۵۷ میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے۔ پھلوں کے بارے میں چونکہ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ انسان کی بنیادی غذا نہیں ہے اور انہیں انسان محض لذت اور فرحت حاصل کرنے کے لیے کھاتا ہے' اس لیے اس لفظ میں خوش طبعی' خوش مزاجی اور تفریح وغیرہ کے معنی بھی آ گئے ہیں۔ اسی معنی میں یہ لفظ حضور ﷺ کے مزاج کی کیفیت کے حوالے سے احادیث میں بھی آیا ہے۔ حضرت حبشی بن جنادہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے بارے میں روایت کرتے ہیں: ((كَانَ اَفْكَهُ النَّاسِ خَلْقًا)) ''آپ ﷺ تمام مخلوق سے بڑھ کر خوش طبع تھے''۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں: مِنْ اَفْكَهِ النَّاسِ مَعَ صَبِيٍّ کہ حضور ﷺ بچوں کے ساتھ بہت زیادہ خوش مزاج ہوا کرتے تھے۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: مِنْ اَفْكَهِ النَّاسِ اِذَا خَلَا مَعَ اَهْلِهٖ کہ حضور ﷺ جب اپنے اہل وعیال کے ساتھ ہوتے تھے تو ہمیشہ خوش طبعی اور خوش مزاجی کا معاملہ فرماتے تھے۔ آیت زیر مطالعہ میں لفظ ''فٰكِهُوْنَ'' کا لفظ اسی مفہوم میں آیا ہے۔

آیت ۵۶ ﴿هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ۝۵۶﴾ ''وہ اور ان کی بیویاں سائے میں تختوں پر تکیے لگائے ہوئے بیٹھے ہوں گے۔''

یعنی ہر جنتی کا انداز ایسا ہوگا کہ جیسے کوئی بادشاہ اپنی ملکہ کے ساتھ تخت شاہی پر تکیے لگائے بیٹھا ہو۔ ہم انسانوں کے ذہنوں میں چونکہ روایتی بادشاہوں کی شان وشوکت کے حوالے سے ایسے تصورات پائے جاتے ہیں اس لیے یہ نقشہ کشی دراصل ہماری تفہیم کے لیے کی گئی ہے' ورنہ

جنت میں ایک عام جنتی کو جو خوشحالی' فارغ البالی اور آسودگی میسر ہوگی دنیا کا بڑے سے بڑا بادشاہ بھی اس کا تصور نہیں کر سکتا۔

آیت ۵۷ ﴿لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ﴿۵۷﴾﴾ ''ان کے لیے وہاں ہر طرح کے میوے تو ہوں گے ہی اور وہ سب کچھ بھی ہوگا جو وہ مانگیں گے۔''

وہ لوگ جس وقت جو چیز طلب کریں گے وہ چیز اسی لمحے ان کے سامنے حاضر کر دی جائے گی۔ دنیا میں تو بڑی سے بڑی شخصیت کا ہاتھ بھی کہیں نہ کہیں پہنچ کر رک ہی جاتا ہے اور اس کی ہر مطلوبہ چیز اسے نہیں مل سکتی' لیکن جنت میں اہل جنت کی ہر خواہش بغیر کسی شرط و استثناء کے پوری کی جائے گی۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں یہ مضمون بایں الفاظ آیا ہے: ﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿۳۱﴾﴾ ''اور تمہارے لیے اس (جنت) میں وہ سب کچھ ہوگا جو تمہارے جی چاہیں گے اور تمہارے لیے اس میں وہ سب کچھ بھی ہوگا جو تم مانگو گے۔''

اللہ تعالیٰ چونکہ ہر شخص کی پسند اور خواہش کو خوب جانتا ہے' اس لیے جنت میں ہر شخص کو اس کے فطری تقاضوں کی بھرپور تسکین کا سامان مہیا کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ہر شخص اپنی ذہنی سطح اور پسند کے اعتبار سے جو کچھ مانگے گا وہ بھی اسے ملے گا۔ یہ ہے جنت کی وہ بادشاہی جس کا مقابلہ و موازنہ دنیا کی کسی بادشاہت سے نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان تمام نعمتوں سے اعلیٰ و ارفع جو نعمت ہوگی وہ ان کے رب کی خوشنودی ہوگی۔

آیت ۵۸ ﴿سَلٰمٌ ۚ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴿۵۸﴾﴾ ''سلام کہا جائے گا رب رحیم کی طرف سے۔''

وہاں ان لوگوں کو رب رحیم کی طرف سے سلامتیوں کے پیغامات آ رہے ہوں گے۔ اس آیت کا مثنیٰ (جوڑا) سورۃ الاحزاب کی یہ آیت ہے: ﴿تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚ وَاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا ﴿۴۴﴾﴾ کہ جس روز مؤمنین متقین اللہ تعالیٰ سے ملیں گے اُس روز اس کی طرف سے انہیں سلام کہا جائے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں سلامتی کا پیغام دیا جائے گا۔ اہل جنت کے احوال کے ذکر کے بعد اب اگلی آیات میں دوسری طرف کا نقشہ دکھایا جا رہا ہے۔

آیت ۵۹ ﴿وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۹﴾﴾ ''علیحدہ ہو جاؤ آج کے دن اے وہ لوگو جو جرم کرنے والے تھے!''

مجرموں اور نیکوکاروں میں تفریق

﴿وَامْتَازُوا الْيَوْمَ﴾ ''آج کے دن تم لوگ الگ ہو جاؤ''۔ امتازوا ''م ی ز'' مادہ سے باب افتعال میں فعل امر جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔ اردو الفاظ امتیاز' ممتاز' تمیز وغیرہ اسی سے مشتق ہیں۔ دنیا میں تو تم لوگ نیکوکاروں کے ساتھ گڈمڈ ہو کر رہتے رہے تھے۔ وہاں نہ تو کسی منافق اور مؤمن میں کوئی امتیاز تھا اور نہ ہی کسی مجرم اور نیکوکار کی بظاہر کوئی پہچان تھی۔ لیکن آج کے دن تم لوگوں کو چن چن کر اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندوں سے الگ کر لیا جائے گا۔

آیت ۶۰ ﴿اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۶۰﴾ ''اے آدمؑ کی اولاد! کیا میں نے تمہیں پابند نہیں کیا تھا اس بات پر کہ تم نہیں بندگی کرو گے شیطان کی؟ یقیناً وہ تمہارے لیے کھلا دشمن ہے۔''

﴿اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ﴾ ''اے بنی آدم! کیا میں نے تمہیں پابند نہیں کیا تھا''۔ واضح رہے کہ عَهِدَ کے بعد جب اِلٰی آتا ہے تو اس کے معنی کسی کو کسی چیز کا پابند کرنے کے ہوتے ہیں۔ جیسے سورۃ البقرۃ کی اس آیت سے بھی واضح ہوتا ہے: ﴿وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝۱۲۵﴾ ''اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو پابند کر دیا تھا' کہ تم ہمارے اس گھر کو پاک اور صاف رکھو گے طواف' اعتکاف اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے''۔ آیت زیر مطالعہ میں جس عہد یا پابندی کا ذکر ہوا ہے اس بارے میں عام رائے یہ ہے کہ اس سے ''عہد الست'' مراد ہے جس کا ذکر سورۃ الاعراف کی آیت ۱۷۲ میں آیا ہے۔ یہ عہد اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کی تمام ارواح سے لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان ارواح سے سوال کیا تھا: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟'' ﴿قَالُوْا بَلٰى﴾ اس پر سب ارواح نے یک زبان ہو کر جواب دیا تھا کہ ہاں کیوں نہیں! اس عہد کو عہدِ الست' میثاقِ الست' عہدِ ازل' میثاقِ ازل وغیرہ عنوانات سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کا لُبِّ لُباب یہ ہے کہ ہر انسان اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کو تسلیم کر کے اس دنیا میں آیا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ انبیاء و رسل علیہم السلام اور الہامی کتابوں کے ذریعے وقتاً فوقتاً اس عہد کے بارے میں بنی نوع انسان کو یاد دہانی بھی کراتا رہا ہے۔ چنانچہ جو لوگ اپنی دنیوی زندگیوں میں اس عہد

کو پس پشت ڈال کر شیطان کے آلہ کار بن جائیں گے' قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا میں نے تم لوگوں سے عہد نہیں لیا تھا اور کیا میں نے تمہیں اس عہد کے ذریعے پابند نہیں کیا تھا؟

﴿اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ﴾ کہ تم شیطان کی بندگی نہیں کرو گے۔ اس حوالے سے یہ حقیقت ہر وقت ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے کہ ہم میں سے کوئی بھی شیطان کو شیطان سمجھتے ہوئے اس کی بندگی (غلامی یا اطاعت) نہیں کرتا' بلکہ شیطان کا آلہ کار بننے والا ہر انسان دراصل اس کے دھوکے میں آ جاتا ہے۔

عبادت کا جزوِ اعظم: اطاعت

واضح رہے کہ اس جملے میں لفظ عبادت کے معنی دراصل اطاعت کے ہیں۔ اس لیے کہ ''اطاعت'' عبادت کا جزوِ اعظم ہے۔ اسی معنی میں یہ لفظ (عبادت) فرعون کے اس مکالمے میں بھی آیا ہے جو سورۃ المؤمنون کی آیت ۴۷ میں نقل ہوا ہے۔ فرعون نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے بارے میں کہا تھا: ﴿وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۝۴۷﴾۔ اس فقرے کا لفظی و لغوی ترجمہ تو یہ ہے کہ ''ان دونوں کی قوم ہماری عبادت کرتی ہے''۔ لیکن ظاہر ہے بنی اسرائیل فرعون کی صرف اطاعت کرتے تھے اور وہ بھی مجبوری سے۔ وہ اس کی پوجا نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا خود فرعون کی مراد بھی اس سے یہی تھی کہ ان کی قوم ہماری ''محکوم اور مطیع'' ہے۔ فرعون کے ساتھ مکالمہ کرتے ہوئے ایک موقع پر یہ لفظ اسی معنی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی استعمال فرمایا تھا' جب فرعون نے آپؑ پر اپنا احسان جتلانے کی کوشش کی تھی: ﴿قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ۝۱۸﴾ (الشعراء) ''فرعون نے کہا کہ کیا ہم نے تمہیں چھوٹے ہوتے اپنے ہاں پالا نہیں تھا؟ اور تم نے اپنی عمر کے بہت سے سال ہمارے ہاں گزارے تھے''۔ فرعون دراصل آپؑ سے کہنا یہ چاہتا تھا کہ ہم نے تجھے پال پوس کر بڑا کیا اور آج تم ہمارے ہی سامنے یوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہے ہو! اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا: ﴿وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝۲۲﴾ (الشعراء) ''اور یہ وہ احسان ہے جو تم مجھے جتلا رہے ہو' جس کے عوض تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے! یعنی ایک فرد کو چند سال اپنے گھر میں رکھنے کا احسان تو تمہیں اب تک بھی نہیں بھولا

اور یہ جو تم نے میری پوری قوم کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے اس بارے میں تمہیں کچھ یاد نہیں؟ گویا ان آیات میں بھی ''عبادت'' کا لفظ اطاعت کے معنی میں ہی آیا ہے۔

اس موضوع کے حوالے سے یہاں یہ نکتہ بھی اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیجیے کہ عبادت کا جزوِ اعظم تو اطاعت ہے لیکن اس کی اصل روح ''محبت'' ہے۔ اس لیے اگر تو کوئی شخص کسی ہستی کی اطاعت اس کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر کر رہا ہے' تو وہ ہستی گویا اس شخص کی معبود ہے' لیکن اگر وہ کسی مجبوری یا جبر کی وجہ سے یہ اطاعت کر رہا ہے تو اسے محض اطاعت ہی کہا جائے گا۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ کے مذکورہ جملے ﴿لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ﴾ کا درست مفہوم یہی ہے کہ تم لوگ شیطان کی اطاعت نہ کرو' اس کی پیروی نہ کرو۔ ﴿اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۶۰﴾ ''وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔'' قرآن مجید میں حضرت آدمؑ اور ابلیس کا واقعہ سات سورتوں (البقرۃ' الاعراف' الحجر' بنی اسرائیل' الکہف' طٰہٰ اور ص) میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شیطان نے روزِ اوّل سے ہی حضرت آدم علیہ السلام اور آپؑ کی اولاد سے دشمنی کا پختہ عزم کر رکھا ہے۔ اپنے اس عزم کا اظہار وہ علی الاعلان کر چکا ہے: ﴿قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۸۲﴾ (ص) ''اس نے کہا: تو تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو یقیناً گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔'' گویا نسل انسانی کے ساتھ شیطان کی دشمنی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

آیت ۶۱ ﴿وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝۶۱﴾ ''اور میری ہی عبادت کرنا۔ سیدھی راہ یہی ہے۔''

آیات ۶۰ اور ۶۱ کی کلمۂ توحید سے مشابہت

ان دو آیات (آیت ۶۰ اور ۶۱) کا انداز اور اسلوب کلمہ توحید سے ملتا جلتا ہے۔ کلمۂ توحید کے پہلے جملے ''لا الٰہ'' میں نفی ہے کہ کوئی معبود نہیں' جبکہ دوسرے جملے ''الا اللہ'' میں اثبات ہے کہ صرف اللہ ایک معبود ہے۔ اسی طرح گزشتہ آیت میں شیطان کی بندگی کی نفی (ممانعت) کی گئی ہے' جبکہ آیت زیر مطالعہ میں اثبات یعنی اللہ کی بندگی کے حکم کا ذکر ہے کہ اے بنی آدم! میں نے تو تم لوگوں سے عہد لیا تھا کہ شیطان کے بہکاوے میں نہ آنا اور میرے بندے بن کر رہنا۔ مگر افسوس کہ تم اس عہد کی پاسداری نہ کر سکے اور اپنے دشمن کے چنگل میں

پھنس کر اس کے اطاعت گزار بن گئے۔اس مختصر سے جملے (اَنِ اعْبُدُوْنِیْ) میں دراصل قرآن مجید کی پوری دعوت کا خلاصہ آ گیا ہے۔تمام انبیاء ورسل علیہم السلام اپنی اپنی قوموں کو یہی دعوت دیتے رہے: ﴿اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ﴾ (حٰمٓ السجدة: ١٤) کہ تم لوگ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو! سورۂ ہود کی ابتدائی آیات میں قرآن مجید کے نزول کا مقصد بیان فرماتے ہوئے بھی یہی بات دہرائی گئی ہے: ﴿الٓرٰ ۣ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ﴾ ''ا،ل،ر۔یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات محکم کی گئی ہیں' پھر کھول کھول کر بیان کر دی گئی ہیں ایک حکیم باخبر ہستی کی طرف سے' یہ کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو!'' گویا تمام انبیاء ورسل اور قرآن کی دعوت کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرے' اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرے۔

عبادت کی شرائط

اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی حقیقت اچھی طرح سے سمجھ لی جائے۔اللہ تعالیٰ کی عبادت دراصل درج ذیل شرائط سے مشروط ہے:

(۱) **اطاعت**: اطاعت عبادت کا جزوِ اعظم ہے۔اللہ تعالیٰ کی اطاعت مطلق (غیر مشروط) اور تمام اطاعتوں سے بالا ہونی چاہیے۔باقی تمام اطاعتیں اس اطاعت کے تابع رہنی چاہئیں۔ مثلاً والدین' اساتذہ' حکام' مرشد وغیرہ کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے دائرے میں رہ کر کی جائے۔حضور ﷺ کا فرمان ہے: لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ کہ مخلوق میں سے کسی کی ایسی اطاعت جائز نہیں جس سے خالق کی معصیت ہوتی ہے۔

(۲) **محبت**: محبت عبادت کی روح ہے۔چنانچہ اطاعت کے ساتھ ساتھ ایک بندے کے دل میں اللہ تعالیٰ کے لیے انتہائی شدید محبت کا پایا جانا ضروری ہے۔یہ محبت تمام محبتوں سے بالا ہونی چاہیے اور باقی تمام محبتیں اللہ تعالیٰ کی محبت کے تابع رہنی چاہئیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ﴾ (البقرة: ١٦٥) ''اور اہلِ ایمان اللہ کی محبت میں بہت سخت ہوتے ہیں''۔

(۳) **دُعا**: حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) ''دعا عبادت کا جوہر ہے''۔

لہٰذا یہ ضروری ہے کہ دعا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ سے کی جائے۔ اسی طرح استعانت اور استغاثہ بھی صرف اسی سے کیا جانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾﴾ (الجن) ''پس تم اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔''

(۴) **مراسمِ عبودیت**: مراسمِ عبودیت میں سے کوئی عمل غیر اللہ کے لیے نہیں ہونا چاہیے۔ مثلاً سجدہ، رکوع، قیام وغیرہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ نذر بھی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مانی جائے۔

(۵) **اخلاص**: عبادت اور اس کے ضمن میں مندرجہ بالا تمام اعمال و جذبات خالصتاً اللہ تعالیٰ کے لیے ہوں۔ سورۃ الزمر میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴿۲﴾﴾ کہ تم اللہ کی عبادت کرو اس کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے۔ یہی حکم سابقہ تمام امتوں کے لیے بھی تھا۔ سورۃ البینہ میں اہل کتاب کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ﴾ (آیت ۵) ''انہیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کریں، اسی کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے، بالکل یکسو ہو کر۔''

مندرجہ بالا پانچ شرائط گویا ''عبادت'' کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ یعنی: عبادت = اطاعت + محبت + دعا + مراسم عبودیت + اخلاص —— البتہ ان پانچوں میں سے اخلاص کا معاملہ بہت حساس اور نازک ہے۔ اس میں معمولی سی ملاوٹ پوری عبادت کو ہی ضائع کر دیتی ہے۔ مثلاً اگر کسی نے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ایک فیصد کسی اور کی عبادت شامل کر دی، تو یہ ملاوٹ اس کی ۹۹ فیصد عبادت کو بھی ضائع کر دے گی۔ اللہ تعالیٰ بہت غیور ہے، وہ اپنی عبادت و اطاعت کے حوالے سے کسی بھی درجے میں ملاوٹ یا شراکت کو گوارا نہیں کرتا۔ علامہ اقبال نے اس فلسفے کو اس طرح بیان کیا ہے:

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے　　شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

آیت ۶۲ ﴿وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ۭ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۲﴾﴾ ''تو اُس نے تم میں سے بہت ساری مخلوق کو بہکا دیا۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے تھے!''

اہلِ جہنم کی سرزنش

ان الفاظ کو پڑھتے ہوئے میدانِ حشر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے، جہاں اللہ

تعالیٰ کی عدالت لگی ہے' نسل انسانی کے عظیم اجتماع میں سے اکثریت کو جہنم کی سزا کا حکم سنایا جا چکا ہے۔ اس کے بعد انہیں مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے: ﴿وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ۭ﴾ کہ اے بنی آدم! شیطان نے تو واقعی تم میں سے بھاری اکثریت کو گمراہ کر دیا ہے۔ گویا اس نے اپنی قسم کو کسی حد تک پورا کر دکھایا ہے: ﴿اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ۝۶۲﴾ تو کیا ہم نے تمہیں عقل نہیں دی تھی؟ ہم نے تو تمہیں فطری استعدادات سے مسلح کر کے دنیا میں بھیجا تھا۔ تمہیں سننے' دیکھنے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ تمہیں اپنی معرفت اور محبت سے نوازا تھا۔ نیکی اور بدی کی پہچان دی تھی۔ یہ سب کچھ ہم نے تمہیں اسی لیے تو دیا تھا کہ شیطان کے مقابلے میں تم سرخرو ہو سکو۔ تو دنیا میں رہتے ہوئے تم لوگ اتنی عقل بھی استعمال نہ کر سکے کہ تم اپنے دشمن کو ہی پہچان سکتے؟ کیا تم اپنے لیے سیدھے اور ٹیڑھے راستے میں بھی تمیز نہ کر سکے؟

آیت ۶۳ ﴿هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝۶۳﴾ ''تو یہ ہے وہ جہنم جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔''

آیت ۶۴ ﴿اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝۶۴﴾ ''اب داخل ہو جاؤ اس میں اس کفر کے سبب جو تم کرتے رہے تھے۔''

اب تمہارے کفر کا صلہ اور بدلہ یہی ہے۔ اور یہ بدلہ تم نے اپنے لیے خود پسند کیا ہے۔

آیت ۶۵ ﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۶۵﴾ ''آج ہم ان کے مونہوں پر تو مہر لگا دیں گے اور ہم سے باتیں کریں گے ان کے ہاتھ اور گواہی دیں گے ان کے پیر اس کمائی کے بارے میں جو وہ کرتے رہے تھے۔''

انسانی اعضاء کی گواہی

﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ﴾ ''آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے''۔ ان الفاظ سے بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس روز کسی مرحلے پر تمام مجرمین کو مہر بہ لب کر دیا جائے گا۔ البتہ اس ضمن میں بعض مفسرین کی رائے یہ بھی ہے کہ صرف بڑے بڑے دیدہ دلیر اور شاطر

قسم کے مجرموں کی زبانوں پر تالے لگائے جائیں گے" تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جا کر بھی جھوٹ بولنے اور جھوٹے بہانے تراشنے کی کوشش نہ کر سکیں۔

﴿وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٦٥﴾﴾ "اور ہم سے بات کریں گے ان کے ہاتھ اور گواہی دیں گے ان کے پیر اس کمائی کے بارے میں جو کچھ وہ کرتے رہے تھے"۔ یہ مضمون قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ سورۃ الرحمٰن میں فرمایا گیا:

﴿فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ﴿٣٩﴾ ..... يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ﴿٤١﴾﴾ "تو اُس دن کسی انسان اور کسی جن سے اس کے گناہوں کی پرسش نہیں کی جائے گی ..... گناہگار اپنے حلیہ ہی سے پہچان لیے جائیں گے، پھر ان کو پکڑا جائے گا پیشانی (کے بالوں) اور قدموں سے۔" اس دن اللہ تعالیٰ کو کسی انسان اور کسی جن سے اس کے اعمال کے بارے میں پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی، بلکہ ان کے اعمال کی پوری تفصیل ان کے چہروں پر لکھی ہوگی۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی ان آیات میں یہ مضمون قدرے زیادہ وضاحت سے آیا ہے: ﴿حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٠﴾﴾ "جب وہ وہاں پہنچیں گے تو ان کے خلاف گواہی دیں گے ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں (جلدیں) جو کچھ انہوں نے کیا تھا"۔ واضح رہے کہ شَهِدَ کے بعد اگر عَلٰی آئے تو اس کے معنی کسی کے خلاف گواہی دینے کے ہوتے ہیں اور اگر اس کے بعد لِ آئے تو اس صورت میں یہ فعل مثبت (کسی کے حق میں) گواہی کے معنی دیتا ہے۔

﴿وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۭ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢١﴾ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَآ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٢٢﴾﴾

"وہ لوگ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف شہادت کیوں دی؟ وہ جواب دیں گی کہ ہمیں اس اللہ نے قوتِ گویائی عطا فرمائی جس نے ہر چیز کو بولنے کی طاقت بخشی ہے، اسی نے تمہیں پہلی مرتبہ (عالمِ ارواح میں) پیدا کیا اور اسی کی طرف تم

سب لوٹائے جاؤ گے۔ اور تم (اپنی بداعمالیاں) اس وجہ سے نہیں پوشیدہ رکھتے تھے کہ تم پر تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں اور تمہاری کھالیں گواہی دیں گی' ہاں تم یہ سمجھتے تھے کہ تم جو کچھ بھی کر رہے ہو اس میں سے بہت سے اعمال سے اللہ بے خبر ہے۔''

اپنی دنیوی زندگی کے دوران میں تو تم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ تمہارے اپنے اعضاء ہی تمہارے خلاف گواہ بن جائیں گے' بلکہ تم تو اپنے دل میں یہ خیال چھپائے پھرتے رہے کہ اللہ کو کہاں معلوم ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں! تم تو اسی گمان میں رہے کہ اتنے زیادہ انسانوں کے بارے میں اتنی چھوٹی چھوٹی تفصیلات بھلا کہاں ریکارڈ ہو رہی ہوں گی؟

آیت ۶۶ ﴿وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ﴿٦٦﴾﴾ ''اور اگر ہم چاہیں تو ان کی آنکھیں مٹا دیں' پھر یہ راستہ پانے کے لیے دوڑیں پھریں' لیکن کہاں دیکھ سکیں گے!''

تنبیہاتِ الٰہیہ سے ڈرنے اور سبق حاصل کرنے کی ضرورت

انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کی تمام صلاحیتیں ہماری عطا کردہ ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری عطا کردہ صلاحیتوں کو یہ لوگ ہماری نافرمانیوں میں صرف کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود ہم فوری طور پر ان کی گرفت نہیں کرتے۔ یہ ہماری رحمت اور مہربانی ہے۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم کسی وقت بھی ان کی کوئی صلاحیت سلب کر سکتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم چاہیں تو انہیں ان کی بصارت یعنی راستہ معلوم کرنے کی بنیادی استعداد سے فوری طور پر محروم کر سکتے ہیں۔ اس مضمون کے حوالے سے یہاں آیت ۹ کو پھر سے ذہن میں تازہ کر لیجیے: ﴿وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿٩﴾﴾ ''ہم نے ان کے سامنے بھی ایک دیوار کھڑی کر دی ہے اور ان کے پیچھے بھی ایک دیوار کھڑی کر دی ہے' اس طرح ہم نے ان کو ڈھانپ لیا ہے تو اب یہ دیکھ نہیں سکتے!'' گویا آیت ۹ میں حق کو جھٹلانے والوں کی ابتدائی سزا کا حوالہ آیا ہے' جبکہ آیت زیر مطالعہ میں ان لوگوں کی سزا کے اگلے درجے کا ذکر ہے کہ جب یہ لوگ اپنی بصارت کے ہوتے ہوئے بھی درست راستہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے تو یہ اسی لائق ہیں کہ ان کی بینائی ہی سلب کر لی جائے' جو کہ ہم جب چاہیں سلب کر سکتے ہیں۔

آیت ۶۷ ﴿وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۷﴾﴾ ''اور اگر ہم چاہیں تو ان کی جگہ پر ہی ان کی صورتیں مسخ کر دیں' تو نہ وہ آگے چل سکیں اور نہ پیچھے لوٹ سکیں۔''

یعنی ان کو سزا دینے کے لیے ہمیں کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ ہم جب چاہیں' جہاں چاہیں ان کی صورتوں اور صلاحیتوں کو مسخ کر سکتے ہیں۔

﴿فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۷﴾﴾ ''پھر نہ تو وہ آگے جانے کے قابل رہیں اور نہ ہی پیچھے لوٹ سکیں''۔ یہ وہی مضمون ہے جو قدرے مختلف انداز میں قبل ازیں آیت ۹ اور آیت ۴۵ میں بھی آ چکا ہے۔ آیت ۹ میں ان کے آگے اور پیچھے دیوار کا ذکر ہے' جبکہ آیت ۴۵ میں انہیں سامنے اور پیچھے کے حالات و حقائق سے ڈرنے کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ بہرحال ان تینوں آیات میں مختلف انداز میں ایک ہی حوالے سے بات ہوئی ہے' یعنی آگے اور پیچھے یا ماضی اور مستقبل کے حوالے سے۔ غور کیا جائے تو ﴿لَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ﴾ اور ﴿وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ﴾ دونوں رونگٹے کھڑے کر دینے والے جملے ہیں۔ ایسی تنبیہات کو پڑھتے ہوئے ہمیں اس حقیقت کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ ہم جو کچھ ہیں اور ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے' وہ سب اللہ کی دین ہے۔ اللہ تعالیٰ جب چاہے' جو چاہے ہم سے سلب کر سکتا ہے۔ چنانچہ ہمیں اس کی عطا کردہ نعمتیں (جان' صلاحیتیں' مال' وقت وغیرہ) اس کی خدمت میں پیش کرنے میں کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے۔ قدیم دور کے ہندی شاعر بھگت کبیر نے اپنے انداز میں یہ فلسفہ اس طرح بیان کیا ہے:

میرا مجھ میں کچھ نہیں جو کچھ ہے سو تورے تیرا تجھ کو سونپتے کیا لاگت ہے موئے!

یعنی میرے پاس اپنا ہے کیا؟ سب کچھ تیرا ہی تو ہے۔ مجھے سب کچھ تو نے ہی تو دیا ہے۔ لہٰذا تیری دی ہوئی چیز تجھی کو لوٹاتے ہوئے میرا کیا لگتا ہے۔ بقول غالب:

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

سورۂ بنی اسرائیل میں یہی بات حضور ﷺ سے فیضانِ وحی کے حوالے سے کہی گئی ہے: ﴿وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ﴿۸۶﴾﴾ ''اور اگر ہم چاہیں تو جو وحی ہم نے آپ کی طرف اتاری ہے سب سلب کر لیں' پھر آپ کو اس کے لیے

ہمارے مقابلے میں کوئی حمایتی میسر نہ آ سکے۔''

ان تنبیہات سے ڈرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں سبق بھی حاصل کرنا چاہیے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں مہلت عمل دی ہے' اور مختلف قسم کی صلاحیتوں سے نوازا ہے' تو اس سے پہلے کہ یہ مہلت ختم ہو جائے' اور اس سے پہلے کہ ہماری یہ صلاحیتیں ہمارے پاس نہ رہیں' ہمیں ان چیزوں کو اللہ کے راستے میں خرچ کر دینے کی فکر کرنی چاہیے اور ان سے استفادہ کرتے ہوئے اللہ کی رضا کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس حوالے سے ہمیں حضور ﷺ کے اس فرمان کو حرزِ جان بنالینا چاہیے: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِرَجُلٍ وَهُوَ يَعِظُهُ ((اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ)) ''رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو۔''

(۱) ((شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ)) ''اپنی جوانی کو بڑھاپے سے پہلے'' یعنی جوانی کی توانائیوں' ہمت اور قوت کار کے ذریعے سے زیادہ سے زیادہ نیک عمل کر لو۔ اور یاد رکھو! بڑھاپے میں خواہش اور کوشش کے باوجود تم کچھ نہیں کر سکو گے۔

(۲) ((وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سَقَمِكَ)) ''اور اپنی صحت کو بیماری سے پہلے (غنیمت جانو)'' یعنی اپنی تندرستی کی کیفیت میں اپنی صلاحیتوں کو آخرت کی تیاری میں کھپانے کی فکر کرو' اس سے پہلے کہ تم بیمار پڑ جاؤ اور خود کچھ کرنے کے بجائے دوسروں پر بوجھ بن جاؤ۔

(۳) ((وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ)) ''اور اپنی خوشحالی کو ناداری سے پہلے (غنیمت جانو)۔'' اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں خوشحالی اور مالی فراغت عطا کر رکھی ہے تو اپنے مال کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کر کے اپنی آخرت سنوارنے کی کوشش کرو۔

(۴) ((وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ)) ''اور اپنی فراغت کو مشغولیت سے پہلے (غنیمت جانو)۔'' اگر فراغت میسر ہے تو اس وقت کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے کاموں میں لگاؤ۔

(۵) ((وَحَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ))[1] ''زندگی کو موت سے پہلے (غنیمت جانو)۔'' اپنی زندگی کو ہمیشہ مہلت عمل کے حوالے سے دیکھو۔ اس سے پہلے کہ موت آ کر تمہارے اعمال کا

---

(۱) شعب الایمان للبیهقی: ۳۳۱۹/۷۔ الترغیب والترهیب للمنذری: ۲۰۳/٤۔ راوی: عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنهما۔

ہر دروازہ بند کر دے' اس مہلت کو نیک اعمال کا زیادہ سے زیادہ اثاثہ جمع کرنے میں صرف کرو۔

الغرض اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کے حوالے سے انسان کو ہمیشہ لرزاں و ترساں رہنا چاہیے اور اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو یہ سب چیزیں یا ان میں سے کچھ عطا کر رکھی ہیں تو ان کے ذریعے سے اسے اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول اور اپنی آخرت سنوارنے کی فکر کرنی چاہیے۔

رکوع ۵

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۭ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ ۝۶۸ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا
يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝۶۹ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ
الْقَوْلُ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۝۷۰ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ
اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ۝۷۱ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ۝۷۲
وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ۝۷۳ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝۷۴ ۭ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ
مُّحْضَرُوْنَ ۝۷۵ فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝۷۶ اَوَلَمْ
يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝۷۷ وَضَرَبَ لَنَا
مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝۷۸ قُلْ يُحْيِيْهَا
الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُۨ ۝۷۹ ۙ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ
الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ۝۸۰ اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓي اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۭ بَلٰي ۤ وَهُوَ الْخَلّٰقُ
الْعَلِيْمُ ۝۸۱ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـــًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۸۲ فَسُبْحٰنَ
الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۸۳

آیت ۶۸ ﴿وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۭ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ ۝۶۸﴾ ''اور جس کو بھی ہم زیادہ عمر دیتے ہیں تو ہم اسے اس کی خلقت میں لوٹا دیتے ہیں۔ تو کیا یہ لوگ عقل سے

کام نہیں لیتے؟''

حیاتِ انسانی کی ایک اہم حقیقت

نَکَسَ کے معنی لوٹنے اور پیچھے کی طرف ہٹ جانے کے ہیں' جبکہ تنکیس (باب تفعیل) کے معنی ہیں کسی کو تدریجاً پیچھے کی طرف لے جانا' رفتہ رفتہ لوٹا دینا۔ اس آیت میں انسان کی توجہ اس آفاقی حقیقت کی طرف مبذول کرائی گئی ہے کہ پیدائش کے بعد انسان کی مختلف صلاحیتیں تدریجاً نشوونما پاتی ہیں' جبکہ عمر ڈھلتے ہی یہ صلاحیتیں تدریجاً کمزور ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور پھر بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی انسان کے قویٰ ایک ایک کر کے جواب دیتے چلے جاتے ہیں۔ بقول غالب:ؔ

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ اب عناصر میں اعتدال کہاں!

یہاں یہ مضمون دراصل گزشتہ دو آیات کے مضمون کے ثبوت کے طور پر آیا ہے۔ گزشتہ دو آیات میں انسان پر واضح کیا گیا ہے کہ اس کی تمام صلاحیتیں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہیں اور اللہ تعالیٰ جب چاہے ان صلاحیتوں کو واپس لے سکتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی اس قدرت کے بارے میں جانتے بوجھتے ہوئے بھی انسان عموماً اپنی صلاحیتوں کے بارے میں مغالطے کا شکار ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر جوانی کے دور میں انسان کے عمومی رویے اور قول و فعل سے عام طور پر یہی تاثر ملتا ہے کہ وہ اپنے علم' اپنی ذہانت' شعلہ بیانی اور جسمانی طاقت جیسی صلاحیتوں کو دائمی اور غیر فانی سمجھتا ہے۔ انسان کی اس غلط فہمی یا خوش فہمی کو دور کرنے کے لیے اس آیت میں اس کی توجہ خِلقت کے اس اوندھے پن کی طرف مبذول کرائی گئی ہے' جس کا مشاہدہ ہر انسان اپنے بوڑھے والدین' عزیز و اقارب اور دوست احباب کے حوالے سے اکثر کرتا رہتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ بڑھاپے میں بڑے بڑے محقق' مدبر' علامہ اور ذہین فطین لوگ بھی بچوں جیسی باتیں اور بچوں جیسی حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ انسان کی عمر کے اس حصے کو قرآن مجید میں ''ارذل العمر'' قرار دیا گیا ہے: ﴿وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ﴾ (الحج: ۵) ''اور تم میں وہ بھی ہیں جو نکمی عمر کی طرف لوٹائے جاتے ہیں' تاکہ اُسے کچھ بھی علم نہ رہے سب کچھ جاننے کے بعد۔''

آج کل تو ''ارذل العمر'' کا وہ عبرت انگیز مرحلہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے جب کسی انسان کی زندگی کی ڈور کسی مشین کے ایک سوئچ کے ساتھ بندھ جاتی ہے' جب اس کے اعضائے رئیسہ (دل' جگر' نظامِ تنفس وغیرہ) ایک ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور ایسی صورت میں وسائل کے بل پر اسے مصنوعی طور پر زندہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بہرحال آیت زیرِ مطالعہ میں خلقت کے اوندھے پن کی یہ مثال انسان کی تذکیر (یاددہانی) کے لیے بیان کی گئی ہے تاکہ ایک باشعور انسان اپنے عزیز و اقارب کے بڑھاپے کی معذوریوں کو عبرت کی آنکھ سے دیکھے اور یہ نصیحت ہمیشہ کے لیے اپنی گرہ میں باندھ لے کہ اس کی زندگی اور جسم و جان کی تمام صلاحیتیں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی عطا کردہ یہ نعمتیں کسی انسان سے کسی وقت بھی واپس لے سکتا ہے۔ چنانچہ اس تلخ حقیقت کا ادراک کر لینے کے بعد انسان کو چاہیے کہ وہ ان نعمتوں کی موجودگی کو غنیمت سمجھے اور انہیں اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے صرف کرنے کی فکر کرے' اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے اور ان میں سے اس کے پاس کچھ بھی نہ رہے۔

اقوام کے عروج و زوال کا فلسفہ

یہاں تنکیس فی الخلق کا ذکر اگرچہ افراد کے حوالے سے آیا ہے' لیکن اس کا اطلاق بعینہٖ قوموں کی زندگی پر بھی ہوتا ہے۔ قوموں کی زندگی اور عروج و زوال کے بارے میں فلسفہ تاریخ کے اسکالرز نے اپنے اپنے نظریے پیش کیے ہیں۔ ان میں جرمن فلاسفر Spengler (۱۸۸۰ء۔۱۹۳۶ء) کا نظریہ بہت اہم اور معقول ہے۔ سپنگلر کہتا ہے کہ قوموں کی زندگی بھی افراد کی زندگی کی طرح ہے۔ افراد کی طرح قومیں بھی پیدا ہوتی ہیں' بچپن اور لڑکپن کے دور سے گزر کر جوان ہوتی ہیں' یعنی اخلاقی و مادی ترقی کے بل پر دنیا میں عروج حاصل کرتی ہیں' اور پھر افراد ہی کی طرح بڑھاپے' بیماریوں اور اضمحلال (اخلاقی و مادی طور پر زوال) کا شکار ہو کر بالآخر مر جاتی ہیں۔ البتہ تاریخی حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو سپنگلر کا یہ نظریہ کلی طور پر مبنی بر حقیقت معلوم نہیں ہوتا' تاہم جزوی طور پر اس کے درست ہونے میں کوئی شک نہیں۔ مثلاً بنی اسرائیل کی تاریخ اس نظریے کو غلط ثابت کر دیتی ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ سے پتا چلتا ہے (سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں بھی اس تاریخی حقیقت کا ذکر ہے) کہ

ایک ہی قوم بلکہ ایک ہی نسل دو مرتبہ مکمل زوال کا شکار ہوئی اور دونوں مرتبہ زوال کی پستیوں سے نکل کر بامِ عروج کی بلندیوں تک پہنچی۔ البتہ مسلمان امت چونکہ مختلف قومیتوں اور نسلوں کے افراد پر مشتمل ہے' اس لیے اس امت کے حوالے سے سپینگلر کا مذکورہ نظریہ جزوی طور پر درست مانا جائے گا۔ یعنی امت مسلمہ کے اندر بعض نسلیں زوال پذیر ہوئیں اور ان کی جگہ بعض دوسری نسلوں نے عروج حاصل کیا۔ جیسے عرب نسل کے مسلمانوں کے زوال کے بعد اسلام کو ترکوں کے حوالے سے عروج ملا۔ پھر ایک نئی قوم نے نئی توانائیوں کے ساتھ اسلام کا جھنڈا لہرایا اور بقول اقبالؔ کعبہ کی پاسبانی کا فریضہ سرانجام دیا:۔

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اب عالمِ اسلام میں پھر سے احیائی عمل بتدریج جاری ہے۔ آثار و قرائن سے محسوس ہوتا ہے کہ مستقبل میں امتِ مسلمہ کو ایک دفعہ پھر عروج ملنے والا ہے۔ عروج کے اس تیسرے دور کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں ہراول دستہ بننے کی سعادت دنیا کی کس قوم کے حصے میں آتی ہے۔ ﴿اَفَلَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۶۸﴾﴾ ''تو کیا یہ لوگ عقل سے کام نہیں لیتے؟'' یہ لوگ اپنے عزیز و اقارب کو بڑھاپے کا شکار ہوتے اور مختلف حادثات کے باعث ان کی فطری صلاحیتوں کو زائل ہوتے دیکھتے ہیں' تو اپنے اس مشاہدے کی بنا پر کیا ان لوگوں کو یہ سادہ سی بات بھی سمجھ نہیں آتی کہ ایسا ہی کوئی حادثہ کسی وقت انہیں بھی پیش آ سکتا ہے۔ اور یہ کہ اگر کوئی انسان اپنی زندگی میں کسی اچانک حادثے کا شکار نہ بھی ہوا تو بھی بڑھاپے کے باعث بالآخر اس کی صلاحیتوں کو زوال پذیر ہونا ہی ہوتا ہے۔

آیت ۶۹ ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ ﴿۶۹﴾﴾

''اور ہم نے اس (پیغمبر ﷺ) کو شعر نہیں سکھائے' اور نہ ہی یہ اس کے شایانِ شان ہے۔ یہ تو بس ایک یاددہانی اور روشن قرآن ہے۔''

قرآن شعر و شاعری نہیں!

جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے' اس رکوع میں توحید' آخرت اور رسالت کے تینوں

مضامین ساتھ ساتھ چلتے ہیں' لہٰذا اس آیت کا تعلق رسالت کے موضوع سے ہے۔

﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ﴾ یعنی ہم نے اپنے رسول ﷺ کو شعر و شاعری کی تعلیم نہیں دی اور شاعری اُن کے شایانِ شان بھی نہیں ہے۔ سورۃ الشعراء میں شعراء اور ان کے پیروکاروں کے بارے میں عمومی مذمت بایں الفاظ آئی ہے: ﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾﴾ ''اور شاعروں کی اتباع تو گمراہ لوگ ہی کرتے ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ وہ (خیالوں کی) ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں' اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں؟'' شاعروں کی اکثریت میں عموماً مندرجہ ذیل تین کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ (اس میں استثناء کا بہرحال امکان ہے۔)

(۱) شاعروں کے ہم نشیں لوگ میدانِ عمل کے شہسوار نہیں ہوتے۔ یہ بات اس حد تک حقیقت پر مبنی ہے کہ ہمارے دور کے عظیم شاعر علامہ اقبال کے ہم نشینوں پر بھی حرف بہ حرف صادق آتی ہے۔ علامہ اقبال کے دوست احباب میں کوئی ایک شخصیت بھی ایسی نظر نہیں آتی جس نے عمل کے میدان میں کوئی نمایاں کام کیا ہو۔

(۲) وہ ہر وقت خیالات کی وادیوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ شعر میں مبالغہ کرنا اور بات بات میں زمین و آسمان کے قلابے ملانا شاعروں کی عادت میں شامل ہے۔

(۳) ان کے قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے بارے میں خود کہا ہے:

اقبال بڑا اپدیشک ہے مَن باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

اسی حوالے سے ایک مرتبہ محمد علی جوہر نے خوش طبعی کے انداز میں علامہ اقبال سے کہا تھا کہ علامہ صاحب! میں آپ کا ایک شعر پڑھ کر مسلمان ہو گیا تھا' جبکہ آپ جہاں تھے' وہیں کے وہیں کھڑے ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی اسی انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ حضرت! اگر قوال کو بھی حال آنے لگے تو وہ دوسروں میں حال کی کیفیت کیسے پیدا کرے گا؟

آیت زیر مطالعہ کے حوالے سے یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ بعض اوقات موقع محل کی مناسبت سے حضور ﷺ کی زبان مبارک سے بھی شعر نما (لیکن مبنی بر حقیقت) کلام ادا ہوا۔ مثلاً حنین کے میدان میں ایک موقع پر بھگدڑ کے باعث جب لشکرِ اسلام کے بیشتر افراد کو

پسپا ہونا پڑا تو آپ ﷺ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ آ گئے: اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِب اَنَا ابْنُ عَبْد الْمُطَّلِب کہ میں نبی ہوں اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔ مطلب یہ کہ بارہ ہزار افراد پر مشتمل یہ لشکر میرے شانہ بشانہ رہے تو بھی میں نبی ہوں اور اگر ان میں سے کوئی ایک شخص بھی میرے ساتھ نہ رہے، میں تب بھی نبی ہوں۔ میری نبوت کا دارومدار لوگوں کی تصدیق و تائید پر نہیں ہے۔ لہٰذا اس نازک موقع پر میں عبدالمطلب کا بیٹا اکیلا بھی میدان میں موجود ہوں۔

بہرحال ایسی اِکّا دُکّا مثالیں احادیث میں ضرور ملتی ہیں جو استثناء کے زمرے میں آتی ہیں۔ لیکن اس ضمن میں اصل حقیقت یہی ہے کہ حضور ﷺ کی طبیعت کو شعر و شاعری سے بالکل مناسبت نہیں تھی۔ اکثر روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ جب آپؐ کوئی مصرع یا شعر پڑھتے تو (فن عروض سے طبیعت کی مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے) اس کے الفاظ آگے پیچھے ہو جاتے اور یوں شعر وزن سے گر کر نثر میں تبدیل ہو جاتا۔ اس حوالے سے ایک دلچسپ واقعہ بھی روایت ہوا ہے۔ حماد بن سلمہؒ علی بن زیدؒ سے اور وہ حسن بصریؒ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ ایک مشہور مصرع اس طرح پڑھا کرتے تھے:

کَفٰی بِالْاِسْلَامِ وَالشَّیْبِ لِلْمَرْءِ نَاهِیا

(دو چیزیں انسان کو برائی سے روکنے کے لیے کافی ہیں: اسلام اور بڑھاپا) ☆

ممکن ہے حضور ﷺ اسلام کا ذکر قصداً پہلے کرتے ہوں (ظاہر ہے اسلام اور ایمان میں ایسی تاثیر یا طاقت تو ہے کہ اس کی وجہ سے تمام تر توانائیوں کے باوجود بھی انسان برائیوں سے رکا رہتا ہے)۔ لیکن الفاظ کے یوں آگے پیچھے ہونے کی وجہ سے مصرع وزن سے تو گر جاتا ہے۔ ایک موقع پر آپ ﷺ نے جب یہ مصرعہ پڑھا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! شاعر نے تو یوں کہا ہے: کَفَی الشَّیْبُ وَالْاِسْلَامُ لِلْمَرْءِ نَاهِیَا لیکن اس کے فوراً بعد حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما دونوں بیک وقت پکار اٹھے: اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ، یَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ﴾ یعنی ہم اللہ کی توحید اور محمد (ﷺ) کی رسالت کی گواہی دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی گواہی دیتے ہیں

☆ بڑھاپے کی ''پارسائی'' کا ذکر مولانا الطاف حسین حالی کے اس شعر میں بھی ملتا ہے:

رُکا ہاتھ جب، پارسا ہو گئے ہم نہیں پارسائی، یہ ہے نارسائی!

کہ اس نے اپنے رسول کو شعر نہیں سکھایا۔

حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی یہ گواہی آیت زیر مطالعہ کے الفاظ: ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ﴾ کی گویا تشریح ہے۔

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۶۹﴾﴾ ''یہ تو بس ایک یاددہانی ہے اور نہایت واضح قرآن ہے''۔ قرآن مجید کا یہی تعارف سورۂ عبس میں بایں الفاظ کرایا گیا ہے: ﴿كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿۱۱﴾﴾ کہ یہ تو بلاشبہ سراپا یاددہانی اور نصیحت ہے۔ یعنی یہ اللہ کا کلام ہے جو تمہاری فطرت کے اندر مضمر حقائق کو تذکیر (یاددہانی) کے ذریعے تمہارے تحت الشعور کی گہرائیوں سے نکال کر شعور کی سطح پر اجاگر کرنے کے لیے نازل ہوا ہے۔

آیت ۷۰ ﴿لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۰﴾﴾ ''تاکہ وہ خبردار کرے (اُس کے ذریعے سے) ہر اُس شخص کو جو زندہ ہے اور حجت قائم ہو کافروں پر۔''

قرآن کا مقصدِ نزول

﴿لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا﴾ ''تاکہ وہ اس کے ذریعے ہر اس شخص کو خبردار کردے جو زندہ ہو''۔ واضح رہے کہ اس سے مراد انسان کی جسمانی نہیں بلکہ معنوی زندگی ہے۔ جسمانی طور پر تو حضور ﷺ کی مخالفت میں پیش پیش رہنے والا ابوجہل بھی زندہ تھا' جبکہ اس کے اندر کا انسان مر چکا تھا۔ اس کی باطنی خباثتوں (بغض' عناد' حمیت جاہلی وغیرہ) کی وجہ سے اس کی روح مردہ ہو چکی تھی اور اس حالت میں وہ محض حیوانی سطح پر زندہ تھا۔ ایسے ہی ''مردہ انسانوں'' کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ (البقرۃ:۷) ''اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے''۔ چنانچہ قرآن مجید صرف اسی انسان کو خبردار کرتا ہے جس کے ''اندر کا انسان'' ابھی زندہ ہو۔ یعنی قرآن مجید کے انذار و تذکیر کے فیضان کی ''آخری حد'' اس انسان تک ہے جس کی روح (کم از کم سطح پر ہی سہی) زندہ ہو اور اس کے اندر اس کی استعدادات باطنی کی کچھ نہ کچھ رمق موجود ہو۔ اس مضمون کی مناسبت سے یہاں آیت ۱۱ کے یہ الفاظ پھر سے ذہن میں تازہ کر لیجیے: ﴿اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ

الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ﴾ کہ اے نبی (ﷺ) آپ صرف اسی شخص کو خبردار کر سکیں گے جو ذکر کا اتباع کرنے والا ہو اور غیب میں ہونے کے باوجود رحمٰن سے ڈرتا ہو۔

﴿وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝۷۰﴾ ''اور قول کافروں پر ثابت ہو جائے''۔ یعنی قرآن کی دعوت کے حوالے سے کافروں پر اتمامِ حجت ہو جائے۔ جن لوگوں کے دلوں پر مہریں لگ چکی ہیں ان پر قرآن کے انذار کا کوئی اثر تو نہیں ہوگا' البتہ اس پیغام کے ابلاغ کے بعد ان پر حجت قائم ہو جائے گی اور قیامت کے دن وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ اے اللہ! ہم تک تو تیرا پیغام پہنچا ہی نہیں تھا۔ یہ مضمون سورۃ النساء کی اس آیت میں واضح تر انداز میں آیا ہے: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝۱۶۵﴾ ''یہ رسول (بھیجے گئے) مبشّر اور نذیر بنا کر' تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت باقی نہ رہے۔ اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا۔''

اللہ تعالیٰ مطلق اختیار کا مالک ہے' لیکن اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ چنانچہ رسولوں کو دنیا میں بھیجنے میں اس کی یہی حکمت کارفرما تھی کہ لوگوں پر اس کی طرف سے حجت قائم ہو جائے۔ یہاں آیت زیر مطالعہ کے یہ الفاظ پڑھتے ہوئے پہلے رکوع کی اس آیت کے مضمون کو بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے: ﴿لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۷﴾ ''قول واقع ہو چکا ہے ان میں سے اکثر پر تو اب وہ ایمان لانے والے نہیں''۔ گویا حضور ﷺ کی مسلسل دعوت و تبلیغ سے مشرکینِ مکّہ پر حجت قائم ہو چکی۔ اب یہ لوگ بات ماننے والے نہیں۔

آیت ۷۱ ﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ۝۷۱﴾

''کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی چیزوں میں سے ان کے لیے چوپائے بھی پیدا کر دیے' جن کے یہ مالک ہو گئے ہیں۔''

توحید' تذکیر اور تشکّر

اب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے حوالے سے توحید' تذکیر اور تشکر کا وہ مضمون پھر سے دہرایا جا رہا ہے جو قبل ازیں تیسرے رکوع میں بھی آ چکا ہے۔

﴿اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَآ اَنْعَامًا﴾ ''تو کیا یہ لوگ غور نہیں کرتے کہ ان کے لیے یہ حیوانات ہم نے اپنے دست قدرت سے بنائے ہیں۔''

﴿فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿۷۱﴾﴾ ''اب وہ ان کے مالک بن بیٹھے ہیں''۔ انہیں سوچنا چاہیے کہ یہ گائے بھینس' اونٹ وغیرہ جانور انہوں نے خود تو نہیں بنائے ہیں۔ ظاہر ہے یہ تمام جانور اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے بنا کر ان کے لیے مسخّر کیے ہیں۔ مگر یہ لوگ انہیں اس طرح اپنی ملکیت سمجھتے ہیں گویا کہ انہوں نے وہ خود تخلیق کیے ہوں۔

آیت ۷۲ ﴿وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا یَاْكُلُوْنَ ﴿۷۲﴾﴾ ''اور ان (مویشیوں) کو ہم نے ان کا تابع فرمان کر دیا ہے' ان میں سے بعض تو ان کی سواریاں ہیں اور بعض کا وہ گوشت کھاتے ہیں۔''

﴿وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ﴾ ''اور ہم نے ان جانوروں کو ان کے سامنے جھکا دیا ہے''۔ لفظ ذلیل کے لغوی معنی ضعیف اور کمزور کے ہیں۔ البتہ اردو میں یہ لفظ استعاراتی طور پر گھٹیا اور کمینہ کے معنی دیتا ہے۔ تو جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے مقابلے میں کمزور رکھا ہے۔ بڑے بڑے طاقتور اور جسیم جانوروں کا انسان کے لیے یوں مسخر ہو جانا انسان کے حق میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ ﴿فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا یَاْكُلُوْنَ ﴿۷۲﴾﴾ ''تو ان میں سے بعض جانوروں پر وہ سواری کرتے ہیں اور بعض میں سے وہ کھاتے بھی ہیں''۔ یہ جانور انسان کے لیے نقل و حمل کا ذریعہ بھی ہیں اور ان سے اس کی غذائی ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں۔

آیت ۷۳ ﴿وَلَهُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ؕ اَفَلَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾﴾ ''اور ان کے لیے ان میں بہت سے اور فائدے ہیں اور پینے کی جگہیں۔ تو کیا یہ لوگ شکر ادا نہیں کرتے؟''

﴿وَلَهُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ﴾ ''اور انسان کے لیے ان جانوروں میں اور بھی بہت سی منفعتیں ہیں۔ مثلاً ان کی اون اور کھالوں کو انسان مختلف انداز سے اپنے استعمال میں لاتا ہے۔ ﴿وَمَشَارِبُ﴾ اور ان سے انسان کو دودھ جیسا مشروب بھی ملتا ہے۔ ﴿اَفَلَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾﴾ تو کیا یہ لوگ شکر نہیں کرتے؟ یہ الفاظ قبل ازیں تیسرے رکوع میں بھی آ چکے ہیں۔ وہاں بھی آیات ۳۳' ۳۴ اور ۳۵ میں اللہ تعالیٰ کی مختلف نشانیوں اور نعمتوں کے ذکر کے بعد آیت ۳۵ کے اختتام پر یہی سوال کیا گیا ہے: ﴿اَفَلَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۳۵﴾﴾ ''تو کیا یہ لوگ شکر نہیں کرتے؟''

لفظ ''شکر'' دراصل قرآن کا key word اور حکمتِ دین کا نقطۂ آغاز ہے۔ تیسرے رکوع کے مطالعے کے دوران میں اللہ تعالیٰ کی آیات (نشانیوں) کے حوالے سے ذکر اور شکر کی اصطلاحات پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔

آیت ۷۴ ﴿وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝۷۴﴾ ''اور انہوں نے اللہ کے سوا کوئی اور معبود قرار دے لیے ہیں' تا کہ ان کی مدد کی جائے۔''

نظامِ شرک کی بنیاد: فلسفۂ سفارش

اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسرے معبود انہوں نے اس امید پر بنائے ہیں کہ وہ اللہ کے ہاں ان کے سفارشی بنیں گے: ﴿وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (یونس:۱۸) ''اور وہ کہتے ہیں کہ یہ (معبود) اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں''۔ شرک کے سارے نظام کی بنیاد دراصل اسی سفارش کے فلسفے پر ہے۔ اس خود ساختہ فلسفے یا عقیدے کا بنیادی مقصد دراصل احتساب اور جوابدہی کے خوف سے جان چھڑانا ہے۔ اس کے لیے کچھ انسان تو سرے سے آخرت ہی کا انکار کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ نہ صرف احتساب کے خوف سے خلاصی حاصل کر لیتے ہیں' بلکہ سفارشی تلاش کرنے کے جھنجھٹ سے بھی آزاد ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے جب آخرت کی باز پرس ہی نہیں تو وہ کاہے کو کسی کے آگے جھکیں اور کیونکر کسی کو نذرانے پیش کریں۔ اس کے علاوہ دنیا میں انسانوں کی ایک قسم وہ بھی ہے جو اللہ کو بھی مانتے ہیں اور بظاہر آخرت پر بھی ایمان رکھتے ہیں' لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی مشقت اٹھانے اور حرام خوری چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ ان لوگوں کو جب کبھی آخرت کے احتساب سے خوف آتا ہے تو وہ اللہ کے علاوہ ایسے سہارے ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کی غلط کاریوں اور حرام خوریوں کے باوجود قیامت کے دن انہیں اللہ تعالیٰ کی باز پرس سے چھڑا لیں' اور جن کا دامن پکڑ کر وہ ''چپکے سے'' جنت میں داخل ہو جائیں۔ چنانچہ دل کے اس چور کی وجہ سے انسان کبھی اولیاء اللہ کی مورتیوں کو پوجتا ہے' تو کبھی فرشتوں کے تصوراتی خدوخال کو بُتوں کی شکل میں ڈھال کر ان کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ قوم نوح کے تمام بُت زمانہ سابق کے اولیاء اللہ کی شخصیات سے منسوب تھے۔ جبکہ اہلِ عرب نے مختلف فرشتوں کے

ناموں پر بُت بنا رکھے تھے۔ مشرکینِ عرب فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں سمجھتے تھے (معاذ اللہ!) اور وہ ان کے بُتوں کو اس لیے پوجتے تھے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی یہ لاڈلی بیٹیاں (معاذ اللہ!) اس کے ہاں ان کی سفارش کریں گی۔

آیت ۷۵ ﴿لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَهُمْ ۖ وَهُمْ لَهُمْ جُندٌ مُّحْضَرُونَ ﴿٧٥﴾﴾ ''وہ ان کی مدد کی طاقت نہیں رکھتے' بلکہ وہ تو خود ان کے لیے حاضر باش لشکری بن جائیں گے۔''

معبودانِ باطل کی حقیقت

﴿لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَهُمْ﴾ حقیقت یہ ہے کہ معبودانِ باطل اپنے پجاریوں کی کسی طرح سے بھی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ باطل معبودوں میں سے کچھ معبود تو ایسے ہیں جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں' یعنی وہ صرف انسانی تصورات کے تراشے ہوئے کچھ نام ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف ادوار میں اولیاء اللہ اور فرشتوں کو بھی معبود بنایا گیا۔ اب ظاہر ہے کہ اللہ کے برگزیدہ بندے اور فرشتے تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں' وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی و مشیت کے خلاف کسی کی سفارش کیسے کر سکتے ہیں؟ زمانہ سابق کے اولیاء اللہ کی ارواح کے بارے میں تو ہم کچھ نہیں جانتے کہ ان کی ارواح عالمِ برزخ کے اندر کس کیفیت میں ہیں' البتہ فرشتوں کے بارے میں ہمیں قرآن و حدیث سے واضح معلومات ملتی ہیں کہ کچھ فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم سے دنیا کے اندر مختلف امور نپٹانے میں مسلسل مصروف رہتے ہیں۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ''جب بھی کچھ لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہو کر اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں اور آپس میں اسے سیکھتے اور سکھاتے ہیں تو ان پر اطمینان کا نزول ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ کی رحمت ان پر چھا جاتی ہے' فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا تذکرہ اپنے مقربین کی محفل میں کرتا ہے''۔ (۱) حضور ﷺ کے اس فرمان سے ثابت ہوتا ہے کہ فرشتے مختلف امور کے حوالے سے ہر وقت انسانوں کے درمیان موجود ہوتے ہیں' لیکن وہ وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم ملتا ہے: ﴿وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۝﴾ (التحریم:٦' النحل:٥٠)۔ وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے آگے رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ ان کا کام

---

(۱) صحیح مسلم' ح: ۲۷۰۰ و سنن ابی داؤد' ح: ۱۴۵۵' راوی: ابوھریرۃ وابو سعید خُدری رضی اللہ عنہما۔

اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل و تنفیذ کرنا ہے' مجرم انسانوں کی سفارش کرنا نہیں۔ اس ضمن میں سورۃ البقرۃ آیت ۲۵۵ (آیت الکرسی) کے یہ الفاظ بہت واضح ہیں: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ ''کون ہے جو اُس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے شفاعت کر سکے؟'' تو قیامت کے دن معبودانِ باطل اپنے پوجنے والوں کی مدد پر بالکل قادر نہیں ہوں گے۔

﴿وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ۝۷۵﴾ ''اور وہ تو خود ان کے لیے حاضر کیے گئے لشکر بن جائیں گے''۔ اس جملے میں هُمْ کی پہلی ضمیر کس کے لیے ہے اور دوسری ضمیر سے کون مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کی آراء مختلف ہیں اور اس لحاظ سے یہ آیت مشکلات القرآن میں سے ہے۔ اس میں ایک امکان تو یہ ہے کہ پہلے هُمْ سے مراد غیر اللہ کی عبادت کرنے والے ہوں اور دوسرا هُمْ معبودانِ باطل کے لیے ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں ضمیروں (هُمْ) کا مفہوم اس کے برعکس ہو۔ بہر حال اس جملے کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ میدانِ حشر میں معبودانِ باطل کی پوجا کرنے والے لوگ اپنے معبودوں کے حوالے سے پکارے جائیں گے۔ مثلاً پکارا جائے گا کہ کہاں ہیں لات کے پجاری؟ وہ سب کے سب یہاں جمع ہو جائیں۔ کہاں ہیں عُزّیٰ کے ماننے والے؟ وہ سب ادھر آ جائیں۔ اس طرح مختلف معبودوں کے پجاریوں کے الگ الگ گروہ بنا کر انہیں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا۔

اس جملے کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ان لوگوں کے معبود خود ان کے خلاف استغاثہ کریں گے' اور اس حوالے سے وہ انہیں الگ الگ گروہوں کی شکل میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کریں گے۔

آیت ۷۶ ﴿فَلَا یَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ۝۷۶﴾ ''تو (اے محمد ﷺ!) ان کی بات آپ کو رنجیدہ نہ کرے۔ ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ کہ وہ چھپا رہے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کر رہے ہیں۔''

مشرکینِ مکّہ میں سے اکثر لوگ دراصل دل سے حضور ﷺ کو اللہ کا رسول مانتے تھے۔ اس ضمن میں آپؐ کی دعوت کے ذریعے ان لوگوں پر اتمامِ حجت ہو چکا تھا۔ ابوجہل کی یہ گواہی تاریخ کے ریکارڈ پر موجود ہے کہ میں محمد (ﷺ) کو ہرگز جھوٹا نہیں سمجھتا۔ لیکن یہ کہ میرے خاندان کی بنو ہاشم کے ساتھ پشت ہا پشت سے مسابقت چلی آ رہی ہے۔ اگر انہوں نے بھلائی کے کاموں میں خرچ کیا تو ہم نے بھی ایسا کیا۔ اگر انہوں نے حاجیوں کو کھانے کھلائے تو ہم

نے ان سے بڑھ کر کھلائے۔ اس طرح جب ہم نے ہر دور اور ہر میدان میں ان کا مقابلہ کیا ہے تو اب میں ان کی نبوت کو مان کر اپنے خاندان کو ہمیشہ کے لیے ان کا غلام کیسے بنا دوں؟ اسی سیاق وسباق میں یہاں فرمایا گیا: ﴿اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٧٦﴾﴾ کہ (اے نبی ﷺ!) ان لوگوں کے دلوں میں چھپی باتوں کو بھی ہم خوب جانتے ہیں۔ ان کی زبانیں اگرچہ ابھی تک آپؐ کی نبوت کے انکار پر اڑی ہوئی ہیں' لیکن ان کے دل آپؐ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے تحت الشعور میں ایک خوف ہے۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ یہ دعوت اب رکنے والی نہیں۔ بظاہر تو یہ لوگ آپؐ کی دعوت کو پھبتیوں اور چٹکیوں میں اڑانے کی کوشش کر رہے ہیں' لیکن ان کے دلوں کے اندر یہ یقین موجود ہے کہ اللہ کے دین کا راستہ روکنا اب ان کے لیے ممکن نہیں رہا۔

آیت ۷۷ ﴿اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿٧٧﴾﴾ ''تو کیا انسان غور نہیں کرتا کہ ہم نے اسے ایک نطفے سے پیدا کیا پھر وہ یکا یک کھلا جھگڑالو بن گیا۔''

انسان کی تخلیق: دعوتِ فکر

ہم نے انسان کو گندے پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا ہے' لیکن یہ اپنی خلقت کی اصل کو بھول کر ہمارے ہی مقابلے میں تن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور ہم پر ہی فقرے چست کرتا ہے۔ خصم کے معنی مدِمقابل اور دشمن کے ہیں۔ خَصِيْمٌ اس سے فَعِيْلٌ کے وزن پر صفتِ مشبہ ہے۔ یعنی دشمنی کرنے والا' جھگڑنے والا۔

آیت ۷۸ ﴿وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ﴿٧٨﴾﴾ ''وہ ہمارے بارے میں تو مثالیں بیان کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول گیا ہے۔ کہتا ہے ان گلی سڑی ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے؟''

﴿وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ﴾ اب یہ اپنی اصل کو بھول کر ہم پر پھبتیاں کسنے لگا ہے۔ گویا ان لوگوں نے ''بازی بازی باریش بابا ہم بازی!''☆ کے مصداق اپنے استہزاء کا

☆ فارسی مثل: جب کوئی چھوٹا کسی بڑی شخصیت سے الجھے تو اس وقت یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے کھیل کھیل میں اپنے باپ کی داڑھی کو بھی کھیل بنا لیا ہے!

دائرہ اب اللہ تعالیٰ کی ذات تک بڑھا لیا ہے۔ اس جملے میں ایک طرح سے حضورﷺ کے لیے دلجوئی کا پہلو بھی ہے کہ اے نبی (ﷺ) ان لوگوں کا مذاق صرف آپؐ کی ذات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اب تو انہوں نے ہم پر بھی فقرے چست کرنا شروع کر دیے ہیں۔ اس لیے اگر ان کے تمسخر واستہزاء میں سے کچھ حصہ آپؐ کو بھی مل رہا ہے تو آپ اس پر دل گرفتہ نہ ہوں۔ اس مفہوم میں اس فقرے کا تعلق آیت ۷۶ کے مضمون سے ہے۔ اس سیاق وسباق میں عبارت کا ربط یوں ہوگا: ﴿فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ...... وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ﴾ کہ اے نبی (ﷺ) آپ ان کی باتوں سے رنجیدہ نہ ہوں...... یہ لوگ تو اپنی اوقات کو بھول کر اب ہم پر بھی پھبتیاں چست کرنا شروع ہو گئے ہیں۔ اب اگلے جملے میں اس پھبتی کا ذکر آ رہا ہے:

﴿قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝۷۸﴾ ''وہ کہتا ہے کون ان ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کر سکتا ہے جبکہ وہ بالکل گل سڑ چکی ہوں گی؟'' کفار کے اس اعتراض اور اشتباہ کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آیا ہے۔ جیسے سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا: ﴿وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝۹۸﴾ ''اور انہوں نے کہا کہ کیا جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا واقعی ہم نئے سرے سے دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟'' آیت زیر مطالعہ کے شان نزول کے حوالے سے تفاسیر میں ایک روایت ملتی ہے کہ ایک شخص واقعتاً قبرستان سے انسان کی ایک گلی سڑی ہڈی اٹھا لایا اور حضورﷺ کو دکھا دکھا کر تکرار کرنے لگا: اے محمدؐ! کیا اس کے بارے میں آپ سمجھتے ہیں کہ یہ دوبارہ زندہ ہو جائے گی؟ آیت زیر مطالعہ میں اس شخص کے اسی مکالمہ کے حوالے سے فرمایا گیا ہے کہ آج ہماری قدرت کو چیلنج کرتے ہوئے اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ہم نے خود اسے کس چیز سے پیدا کیا تھا۔

آیت ۷۹ ﴿قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُ ۝۷۹﴾

''آپ کہہ دیجیے کہ وہی اس کو زندہ کرے گا جس نے اس کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا، اور جو ہر طرح کی تخلیق کو بخوبی جاننے والا ہے۔''

جس خالق نے پہلی مرتبہ اسے پیدا فرمایا تھا وہی اسے دوبارہ زندہ کرے گا۔ اس خالق کی خلاقی اور صناعی کی صلاحیتیں اب ختم تو نہیں ہو گئیں۔

﴿وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُ ۝۷۹﴾ اور وہ اپنی تمام مخلوقات سے باخبر ہے۔ اسے اپنی تمام

مخلوق کے تمام معاملات کا علم ہے۔ اسے خوب معلوم ہے کہ مرنے کے بعد کس انسان کے جسم کے کون سے اجزاء کس حالت میں کہاں پڑے ہیں۔ اس سے اس کائنات کی چھوٹی بڑی کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔

آیت ۸۰ ﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ۝۸۰﴾ ''(وہی ہے) جس نے سبز درخت سے تمہارے لیے آگ پیدا کر دی جس سے تم آگ سلگاتے ہو۔''

اللہ تعالیٰ کی خلاقی اور صناعی کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ وہ ہرے بھرے درختوں سے تمہیں آگ عطا کرتا ہے۔ اس آیت کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے درختوں کی لکڑی میں آگ جلانے کی صلاحیت رکھ دی ہے۔ جن لکڑیوں کو ہم بطور ایندھن جلاتے ہیں ظاہر ہے کبھی وہ ہرے بھرے درختوں کی شکل میں تھیں۔ البتہ زیادہ تر مفسّرین کی رائے میں یہاں اَلشَّجَرِ الْاَخْضَرِ سے مراد ''المَرخ'' اور ''العَفار'' نام کے درخت ہیں جو زمانۂ قدیم میں عرب کے ریگستانوں میں پائے جاتے تھے۔ ان درختوں کا ذکر تاریخی روایات میں تو ملتا ہے' مگر آج اس علاقے میں ایسا کوئی درخت نہیں پایا جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ ان درختوں کے اندر قدرتی طور پر یہ صلاحیت موجود تھی کہ ان کی لکڑیوں کو آپس میں رگڑنے سے آگ کا شعلہ نکلتا تھا۔ گویا پرانے زمانے میں جس طرح چقماق کے پتھر کو رگڑ کر آگ جلائی جاتی تھی' اسی طرح ان درختوں کی لکڑیاں بھی انسان کے لیے آگ پیدا کرنے کا ایک ذریعہ تھیں۔

آیت ۸۱ ﴿اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ بَلٰی ۚ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ۝۸۱﴾ ''تو کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وہ اس بات پر قادر نہیں کہ ان جیسی مخلوق دوبارہ پیدا کر دے؟ کیوں نہیں! وہ تو ماہر خلاق اور سب کچھ جاننے والا ہے۔''

انسانوں کو دوبارہ زندہ کرنے کے بارے میں یہ دلیل قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آئی ہے۔ سورۃ القیامہ میں فرمایا گیا:

﴿اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَكَ سُدًی ۝۳۶ اَلَمْ یَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی ۝۳۷ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰی ۝۳۸ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰی ۝۳۹

اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿٤٠﴾

''کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا وہ حقیر پانی کی ایک بوند نہیں تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکائی جاتی ہے؟ پھر وہ علقہ بنا' پھر اللہ نے اس کو بنایا اور اس کے اعضاء درست کیے۔ پھر اسی سے اُس نے دو جوڑے بنائے' نر اور مادہ۔ تو کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مُردوں کو زندہ کر دے؟''

﴿بَلٰى ۚ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿٨١﴾﴾ ''کیوں نہیں؟ وہ تو ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور ہر چیز کا جاننے والا ہے''۔ تم لوگ اپنے ذہن اور تصور کی تنگی کی وجہ سے بعث بعد الموت کو ناممکن سمجھتے ہو' ورنہ اللہ جو قادر مطلق اور خلّاق العلیم ہے اس کے لیے تو یہ کچھ بھی مشکل نہیں۔

آیت ۸۲ ﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٨٢﴾﴾ ''وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اسے کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔''

اس کی قدرت کی شان تو یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کے بنانے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس چیز کو حکم دیتا ہے اور وہ اس کی مرضی کے عین مطابق وجود میں آ جاتی ہے۔

آیت ۸۳ ﴿فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٨٣﴾﴾ ''پس پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے اور جس کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے۔''

جب اس کائنات اور کائنات کی ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو ظاہر ہے اس کائنات پر حکومت بھی اُسی کی ہے اور اُس پر اختیار بھی اسی کا چلتا ہے۔ سورۃ الاعراف میں اس حوالے سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ﴾ (آیت ۵۴) ''خبردار رہو! اسی کا کام ہے پیدا فرمانا اور اُسی کو اختیار ہے حکم دینے اور فیصلہ کرنے کا''۔ اللہ تعالیٰ کی صفات ''خلق'' اور ''امر'' کے ضمن میں یہاں یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ آیات زیر مطالعہ (آیات ۸۲ اور ۸۳) میں اللہ تعالیٰ کی سبوحیت کا ذکر اس کی صفت ''امر'' کے اعتبار سے ہوا ہے' جبکہ اس سورت کی آیت ۳۶ (سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ .....) میں اس کی سبحانیت اور قدوسیت کا ذکر اس کی صفت ''خلق'' کے حوالے سے آیا ہے۔ اس لحاظ سے ان آیات کے مابین ایک خاص ربط اور تعلق ہے۔

بارک اللہ لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم